U32306.

Date 30-12-19

Title - 1943 KI MAIYAARI GHAZLEIN AUR ~~NAZ~~ NAZMEIN.

Creator - Murattiba Idara Hindustani Publishers

Publisher - Idara Hindustani Publishers (Delhi).

Date - 1944

Pages - 104.

Subject - Urdu Shayari - Intikhab Kalaam.

معیاری غزلیں

اور

نظمیں

ادارۂ

ہندوستانی پبلشرز

طبع اول   فروری ۴۴ء   قیمت ایک روپیہ

سول ایجنٹس

نگارستان ایجنسی اردو بازار۔ دلی

ہندوستانی پبلشرز دلی

[illegible] پرنٹنگ پریس [illegible]

سنہ ۱۹۴۳ء

کی

معیاری غزلیں

اور

نظمیں

ادارۂ
ہندوستانی پبلشرز
آر

اعمال نامہ

جس میں نہ صرف ملک ہند کی سو سالہ تاریخ ہی درج ہے بلکہ ہماری معاشرتی زندگی کی تصویر، اقتصادیات کے سمندر کا مدوجزر سیاست کے پُرسکون سمندر میں محبت کے پیدا کئے ہوئے طوفان شعروادب کی لطیف چھیڑ چھاڑ۔ نظامِ حکومت پر بے لاگ اور تحقیقی تنقید بھی شامل ہوئی ہے۔ جو سر سید رضا علی سی۔ بی۔ کے۔ ٹی۔ ای۔ ایم۔ ایل۔ اے کی

خود نوشت سوانح حیات ہے

قیمت مجلد آٹھ روپے (عـہ)

سنہ ۴۳ء کی منتخب غزلیں

جس میں مندرجہ ذیل شعرا شریک ہیں

اثر لکھنوی۔ احسان دانش۔ علی اختر۔ جاں نثار اختر۔ اختر شیرانی۔ اختر انصاری۔ آرزو لکھنوی۔ اظہار رامپوری۔ امن لکھنوی۔ بہزاد لکھنوی۔ تاباں۔ تابش۔ ثاقب لکھنوی۔ جذبی۔ جگر مرادآبادی۔ جمیل۔ جوش ملیح آبادی۔ حزیں۔ حفیظ جالندھری۔ حسرت۔ خمار۔ روش۔ زار۔ ساغر۔ سائل دہلوی سحر۔ سرفروش۔ سہا۔ سیماب اکبرآبادی۔ شعری۔ شکیل۔ صفیہ شمیم۔ صابر۔ صفی۔ ضیا۔ طالب۔ ظفر علی خاں عرش۔ فراق۔ فیض۔ کیفی۔ گوہر۔ ماہر۔ مجاز۔ منور۔ نازاں۔ نجم۔ نخشب۔ احمد ندیم قاسمی۔ نوح۔ نہال۔ واثق وحشت۔ یگانہ۔

قیمت ایک روپیہ

ہندوستانی پبلشرز دلی

۱۹۶۳ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں

اس سال ہم نے ایک اور قدم اٹھایا ہے اور وہ معیاری نظموں کا اضافہ ہے، جو غزلوں کے ساتھ ہی شائع ہو رہی ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ ماحول کا بولتا ہوا عکس لئے آپ کے سامنے ہندوستان کے مشاہیر شعرا جمع ہیں۔

احساس کی شدّت اور وقت کے ساتھ دوڑنے میں آپکو اس میں کہیں کہیں آتشیں نغمے بھی نظر آئیں گی اور کہیں کہیں شبنمی الفاظ ٹپکتی ہوئی رُوح کو سکون پہنچاتے ہوئے بھی ملیں گے۔ ہمیں اسکا اعتراف ہے کہ کچھ نئے مشاہدے اور احساسات رہ بھی گئے ہیں، جن کو ہم اگلے سال کی خاطر میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر سکیں گے۔

جہاں تک ہو سکا ہے۔ نئے اور پُرانے شاعروں کے بدلتے ہوئے رجحانات اور وقت و ماحول کی صحیح عکاسی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے جس گوشے سے بھی زندگی کو رُوح پرور پیام ملا۔ اب ہم اُن پیامات کو اُن احساسات و تغیرات کو اہلِ نظر، اہلِ دل اور اہلِ ادب حضرات کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

ادارہ

معیاری غزلیں

فہرست

معیاری نظمیں ——— فہرست

غزل

مبارک رہے تم کو خوابوں کی دنیا — مجھے چاہیئے اضطرابوں کی دنیا
تمناؤں میں دلکشی ہے تو، لیکن — سمجھ ان کو نازک حبابوں کی دنیا
نیا آسماں ہے ۔ ستارے نئے ہیں — کبھی دیکھ تو ہم خرابوں کی دنیا
بہارِ مجسم خراماں گل افشاں — ارے توبہ مہکے شبابوں کی دنیا
ستارے چُرا لائے یارب کہاں سے — کسی ماہ پیکر کے خوابوں کی دنیا
کوئی حل کرے کیا معمائے ہستی — حجابوں کے اندر حجابوں کی دنیا
تکلم سے بڑھکر خموشی نے لوٹی — محبت کے حاضر جوابوں کی دنیا
فقط دیدۂ پاک بیں کے لئے ہے — محبت کے معصوم خوابوں کی دنیا
ہوئی اپنے ہی خون میں غرق آخر — تعیش کی دنیا شرابوں کی دنیا
جو پائندہ ہوگی محبت سے ہوگی — یہ دنیا کہ ہے اضطرابوں کی دنیا

اثرؔ شورِ زاغ و زغن سے ہے بالا
بلند آشیانہ عقابوں کی دنیا

اثرؔ ـ لکھنوی

غزل

جھنڈے گڑے ہیں باغ میں ابرِ بہار کے — قربان جاؤں رحمتِ پروردگار کے
گلشن میں چند راتیں خوشی کی گذار کے — ابرِ رواں کیساتھ گئے دن بہار کے
وہ رنگ اب کہاں چمنِ روزگار کے
بلبل کے نغمے ہیں نہ ترانے ہزار کے
رسوائی کے دن آئے کسی بیگسار کے — آنے لگے سلام چمن سے بہار کے
بیتاب ہو رہے ہیں ترے انتظار کے — آ اے مری بہار دن آئے بہار کے
ابرِ سیہ میں برقِ حسیں لہلہا اٹھی
یا آ گئے وہ سامنے گیسو سنوار کے
اے ابر سے سنبھال کہ ہم ہاتھ سے چلے — اے توبہ الوداع کہ دن آئے بہار کے
باغوں پہ جھوم جھوم کے بادل نہیں اٹھے — گیسو بکھر رہے ہیں عروسِ بہار کے
آؤ کہ ایسا وقت نہ پاؤ گے پھر کبھی — آتے ہیں روز روز کہاں دن بہار کے
اختر کسی کے گھر سے اس انداز سے چلے
جیسے گذار آئے ہوں سب دن بہار کے

اختر شیرانی

غزل

دل کی نبضیں نوکِ خنجر سے کوئی چھوتا نہیں
یہ حدیثِ آرزو ہے اسے نگارِ نکتہ چیں

اس تکلف سے پلائی رات ساقی نے شراب
جھکنے والی تھی مرے قدموں پہ گردوں کی جبیں

کون سمجھے گا جہانِ آب و گل میں رازِ شوق
آسمانوں سے اُدھر آباد ہے میری زمیں

ربطِ مرگ و زندگی کیا ہے جنوں سے پوچھئے
عقل اس نازک حقیقت کو سمجھ سکتی نہیں

پیرِ میخانہ مری پستی پہ حیراں ہو گیا
میں نے جب کر لی گوارا آپ وُردِ تہ نشیں

وسعتِ کونین سے آگے نکل آیا ہے عشق
اب تنگ ظرفی نظر آتی ہے دنیا ہو کہ دیں

شمع روشن کر رہا ہوں آنے والوں کے لئے
اخترِ ناشاد میں اس عہد کا شاعر نہیں

علی اختر

غزل

ان کی نظروں میں مجسم دل ہوا جاتا ہوں میں
اب تو خود ہی ناز کے قابل ہوا جاتا ہوں میں

جذب ہوتا جا رہا ہے مجھ میں جلوۂ حسن کا
آپ ہی شمعِ سرِ محفل ہوا جاتا ہوں میں

ایک آنسو میں ڈھلی جاتی ہے ساری زندگی
دامنِ جاناں ترے قابل ہوا جاتا ہوں میں

خواب آسا زلفِ شبگوں، شبنم آسا چشمِ ناز
آج تیرے حسن کا قائل ہوا جاتا ہوں میں

اب تو مجھ کو حالتِ دل پر ہنسی آنے لگی!
اب تو تیرے رحم کے قابل ہوا جاتا ہوں میں

چومتا ہے یہ مرے قدموں کو کس کا آستاں
کس حریمِ ناز میں داخل ہوا جاتا ہوں میں

جان نثار اختر

غزل

عیشِ دنیا جسے کہتے ہیں فدا ہے تم پر
ہم دل اپنا غمِ دوراں کو دیئے بیٹھے ہیں

ہم ہستی کی تم اک موجِ سکوں پرور ہو
دل میں ہم حشر کے طوفان لئے بیٹھے ہیں

پھول جھڑتے ہیں دمِ نطق تمہارے منہ سے
تلخ گفتار ہیں ہم ہونٹ سئے بیٹھے ہیں

بادۂ ناب سے سرشار ہو شاداب ہو تم
غم سلامت رہے ہم زہر پئے بیٹھے ہیں

عمر بھر اوروں کو برباد کیا ہے تم نے
اور ہم خود کو ہی برباد کئے بیٹھے ہین

اختر انصاری

غزل

آہ میری رسا نہیں ہوتی
کیوں موافق ہوا نہیں ہوتی

بندگی کا خیال ہے ناحق
بندگی جب ادا نہیں ہوتی

جبر کی انتہا تو ہوتی ہے
صبر کی انتہا نہیں ہوتی

میں تو دنیا سے ہو بھی جاؤں جدا
مجھ سے دنیا جدا نہیں ہوتی

کیا کہیں دل کی بات اے بسملؔ
شاعری میں ادا نہیں ہوتی

بسملؔ الہ آبادی

غزل

یہ لُٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے، کہاں وہ جانِ بہار ہے
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی کو فشار ہے

تجھے مرحبا کہ دلِ فگار بہ حالِ زار و نزار ہے
ترے دردِ عشق کو آفریں مری زندگی مجھے بار ہے

یہ انیسِ غمکدۂ قفس، ہے عزیز جاں مجھے ہم نفس!
دلِ داغدارِ غمِ بہار ہیں، یادگارِ بہار ہے

تمہیں جاں فروز بنا کے جس نے جہاں فروز بنا دیا
وہ فروغِ بزمِ جمال کون ہے؟ عشقِ نادرہ کار ہے

ترے باغ میں نئی بہار؟ تجھکو مبارک اے مرے باغباں
جو کھبا ہے میری نظر میں پھول۔ وہ انتخابِ بہار ہے

غمِ آشیاں مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں
یہ نوید مرگ ہے ہم قفس کہ چمن میں جوشِ بہار ہے

میں بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں؟
تری یہ رضا ہے، تو اس رضا پہ بہارِ عمر نثار ہے

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا؟ غمِ دوست دردِ نگار ہے

"تاجور"

غزل

راحت کا مقدور کہاں تھا غم ہی گوارا ہو جاتا
زیست کا کوئی پہلو تو جینے کا سہارا ہو جاتا

وحشت کی ایک ایک ادا میں حسنِ بہاراں ارزاں تھا
عہدِ خزاں میں در پردہ ہی کوئی اشارا ہو جاتا

کوئی نفس تو عنواں بنتا ذوقِ ثباتِ ہستی کا
دم ہی لبوں پر آتے آتے نام تمہارا ہو جاتا

مجھ کو گوارا اپنی حیاتِ غم کی اک اک محرومی
کاش ہر اک محرومی کا احساس گوارا ہو جاتا

ایک نگاہِ لطف سے کیا کچھ ضبط کی قوت بڑھ جاتی
پرسشِ غم سے اور تو کیا ہاں دل کو سہارا ہو جاتا

عالم یہ احساسِ نظر کا خود بھی نظر پر بار ہیں ہم
دل کہتا ہے حشرِ تجلّی کوئی نظارا ہو جاتا

ترکِ تمنّا پر دلِ تنہا کیا کیا غم آمادہ ہے
پھر بھی یہ ارمان ہے تابشؔ کوئی ہمارا ہو جاتا

تابشؔ دہلوی

غزل

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ، کیا تجھکو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی، ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا! ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانئے وہ دن کب آئے
جس دن کیلئے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

معین احسن جذبی

غزل

وہ مجسم مری نگاہ میں ہے — اک جھلک جس کی مہر و ماہ میں ہے
کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے — جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے
میکدے میں نہ خانقاہ میں ہے — میری جنّت تری نگاہ میں ہے
ہائے وہ رازِ غم کہ جو اب تک — مرے دل میں تری نگاہ میں ہے
ڈگمگانے لگے ہیں پائے طلب — دل ابھی ابتدائے راہ میں ہے
عشق میں کیسی منزلِ مقصود — وہ بھی اک گرد ہے جو راہ میں ہے
میرے پندارِ عشق پر مت جا — یہ ادا نازِ گاہ گاہ میں ہے
نقشِ حیرت ہے آج حسن بھی خود — کون یہ عشق کی نگاہ میں ہے
مستیٔ چشمِ یار کیا کہئے — مے تو کیا میکدہ نگاہ میں ہے
اللہ اللہ اتحادِ مذاق — عالمِ دل بھی اب نگاہ میں ہے

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر
وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

جگر مرادآبادی

غزل

عشق میں رنگیں جوانی ہوگئی
زندگانی زندگانی ہو گئی

تم جو یاد آئے تو ساری کائنات
ایک بھولی سی کہانی ہو گئی

موت سمجھا تھا میں اُلفت کو مگر
وہ حیاتِ جاوِدانی ہوگئی

خونفشاں تھے سبھی زخمِ جگر
ہنس پڑے تم گلفشانی ہوگئی

اُن کی آنکھیں دیکھکر اپنی نظر
کاشفِ رازِ نہانی ہوگئی

چلتے چلتے ان کی تیغِ آب دار
موجِ آبِ زندگانی ہوگئی

پھر ہے دل سرگرمِ نالہ شام سے
رات پھر اپنی سہانی ہوگئی

خامُشی سے کھُل گئے اسرارِ حق
سو زباں اِک بے زبانی ہوگئی

ہم نے جس دنیا کو دیکھا تھا جلیل
آج وہ قصہ کہانی ہوگئی!

جلیل مانکپوری

غزل

رُکنے لگی ہے نبضِ رفتارِ جاں نثاراں
کب تک یہ تند گامی اے میرِ شہسواراں

اٹھلا رہے ہیں جھونکے بوچھار آ رہی ہے
ایسے میں تو بھی آجا اے جانِ جاں نثاراں

کب سے مچل رہی ہے اس زلفِ خم بہ خم میں
تعبیرِ خوابِ سُنبل تفسیرِ بادو باراں

خُوبانِ شہر کیا کیا اترا کے چل رہے ہیں
آ بوستاں میں در آ۔ اے فاتحِ نگاراں

آنکھیں ہیں زخم خوردہ، دل ہی خزاں گزیدہ
تکلیفِ یک تبسم اے دولتِ بہاراں

ہاں جوشؔ کا ادب کر، یہ رندِ بادہ کش ہی
سردارِ نکتہ سنجاں، سرخیلِ پختہ کاراں

جوشؔ:۔ ملیح آبادی

غزل

جب دعائیں بھی کچھ اثر نہ کریں
کیا کریں صبر ہم اگر نہ کریں

داستاں ختم ہو ہی جائے گی
آپ قصہ تو مختصر نہ کریں

چھوڑتا ہی نہیں ہمیں صیاد
ورنہ پروائے بال و پر نہ کریں

ہُو کا عالم حرم میں ہے اے شیخ
ہم تو دو دن یہاں بسر نہ کریں

قابلِ عفو ہیں نہیں نہ سہی
نہ کریں آپ درگذر نہ کریں

ان کو احساسِ دردِ دل کیسا
مر بھی جاؤں تو آنکھ تر نہ کریں

اس کی بے چارگی کا کیا کہنا
جس کی آہیں بھی کچھ اثر نہ کریں

یہ بھی تشہیرِ شاعری ہے جوشؔ
آپ دیوان مشتہر نہ کریں

جوشؔ ملسیانی

غزل

چادر جو کہیں حسنِ رخِ یار کی سرکی
قابو میں طبیعت نہ رہی ذوقِ نظر کی

سوتے ہیں جو دیکھا تھا رُخِ یار کا عالم
آنکھوں میں یہ خنکی ہے اُسی نورِ سحر کی

ہے شوق بھی گرویدہ ترے نقشِ قدم کا
مائل ہے عقیدت بھی ترے سجدۂ در کی

چاہا تھا کہ پھر اُن کو نہ چھیڑیں گے پہ چھیڑا
خواہش کوئی پھر اُن سے نہ کرنی تھی مگر کی

آجاتی ہے ناگاہ جدائی کی مصیبت
ہوتی ہے خبر کس کو ترے عزمِ سفر کی

یا حسن ہے یا عشق ہر اک نقش یہاں کا
کیا بات ہے اے شوخ تیرے رہگذر کی

کچھ فائدہ حسرتؔ نہ ہوا ضبطِ ہوس کا
پوشیدہ محبت نہ رہی "عُش" بسر کی

حسرت موہانی

غزل

گلکاریٔ خونِ دل سے زمینِ صحرا کی گلستاں کون کرے
ہے سِرّ عیاں رازِ رگِ جاں تشریحِ رگِ جاں کون کرے

اس دل کو کوئی کیا شاد کرے ہوں جس میں ہزاروں ویرانے
اک گھر ہو اُسے آباد کریں تعمیرِ بیاباں کون کرے

ہم دورِ خزاں میں بھول چکے آداب و رسومِ موسمِ گل
اب موسمِ گل کی آمد پہ تعظیمِ بہاراں کون کرے

جب دل تھا اسیرِ شعلۂ غم، تھی کوششِ آہ و نالہ بجا
اب کیا ہے غمِ پنہاں کے سوا عرضِ غمِ پنہاں کون کرے

اے دورِ طرب تکلیف نہ کر دن بیت گئے امیدوں کے
محفل میں چراغاں ہو نہ سکا مدفن پہ چراغاں کون کرے

محتاجِ وفا ہیں اہلِ جہاں پھر جنسِ وفا کیوں عام نہیں
ہر وقت ہے قدرِ جنسِ وفا اس جنس کو ارزاں کون کرے

آغازِ نمودِ غم سے حسیں آہوں کو ملی ہے وسعتِ دل
اس تنگ فضا کی دنیا میں آہوں کو پریشاں کون کرے

وزیر الحسن

غزل

مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
سخن ہے نالۂ دل نغمۂ رباب نہیں

اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں
تو حشر میرے لئے وجہِ اضطراب نہیں

نہیں شراب کی پابند زندگی میری
یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جو کامیابِ محبت ہو سامنے آئے
میں کامیاب نہیں - ہاں میں کامیاب نہیں

قفس میں زمزمہ پیرا ہے روحِ آزادی
صدائے مرغِ قفس ہے نفیرِ خواب نہیں

انھیں کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی، میں تو بے حجاب نہیں

سنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و حور و طہور
خدا کا شکر کہ نیت مری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیئے جنابِ حفیظ
فقط زبان یہاں قابلِ خطاب نہیں

حفیظ جالندھری

غزل

دل کہہ رہا ہے اُن کی نظر دیکھتے ہوئے
دیکھینگے کیا اِدھر وہ اُدھر دیکھتے ہوئے

امید تھی کسے کہ گزر جائیں گے یہ دن
دل پر دُتورِ غم کا اثر دیکھتے ہوئے

اپنا تو حال یہ ہے کہ اک عمر کٹ گئی
دنیائے دل کو زیر و زبر دیکھتے ہوئے

ہوتا ہے آپ پر بھی اثر کوئی یا نہیں
یہ انقلابِ شام و سحر دیکھتے ہوئے

کچھ اس طرف سے نامہ و پیغام ہی سہی
مدت ہوئی ہے جانبِ در دیکھتے ہوئے

بیداد کیجئے، ستم ایجاد کیجئے
لیکن کسی کا قلب و جگر دیکھتے ہوئے

حیرتؔ سے اختلاف کسی کا عجب نہیں
حیرت کا منتہائے نظر دیکھتے ہوئے

حیرتؔ شملوی

غزل

طبیعت زندگی سے بدگماں معلوم ہوتی ہے
محبت چشمِ بد دور اب جواں معلوم ہوتی ہے

بلا کچھ سوچے سمجھے ایک ہو جاتی ہیں دو روحیں
محبت اتحادِ ناگہاں معلوم ہوتی ہے

ازل سے کہہ رہے ہیں عشق کی روداد سب لیکن
ابھی تک ابتدائے داستاں معلوم ہوتی ہے

جھلکتا تو ہے میرے آنسوؤں میں دکھ مرا لیکن
جو سچ مچ بیتتی ہے وہ کہاں معلوم ہوتی ہے

نظر یوں تو نظر کے ماسوا کچھ بھی نہیں لیکن
اُتر جاتی ہے جب دل میں سناں معلوم ہوتی ہے

خدا محفوظ رکھے ہجر کے اس سخت عالم سے
نفس کی آمد و شد جب گراں معلوم ہوتی ہے

کہانی سی کبھی گذرے ہوئے ایامِ رنگیں کی
مجھی کو اب حدیثِ دیگراں معلوم ہوتی ہے

نگاہیں پھر چکیں ان کی وفائیں ہو چکیں رسوا
خمار اب زندگی بارِ گراں معلوم ہوتی ہے

خمار بارہ بنکوی

غزل

جو بے ثبات ہو اُس سرخوشی کو کیا کیجے
یہ زندگی ہے تو پھر زندگی کو کیا کیجے

رُکا جو کام تو دیوانگی ہی کام آئی
نہ کام آئے تو فرزانگی کو کیا کیجے

یہ کیوں کہیں کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا
مگر سرشت کی آوارگی کو کیا کیجے

کسی کو دیکھ کے اِک موج لب پہ آ تو گئی
اُٹھے نہ دل سے تو ایسی ہنسی کو کیا کیجے

ہمیں تو آپ نے سوزِ الم ہی بخشا تھا
جو نور بن گئی اس تیرگی کو کیا کیجے

جہاں غریب کو نانِ جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے درسِ خودی کو کیا کیجے

وصالِ دوست سے بھی کم نہ ہو سکی راشدؔ
ازل سے پائی ہوئی تشنگی کو کیا کیجے

ن۔م۔ راشد

غزل

بجلی کی زد سے دُور نہ خوفِ خزاں سے دُور
ہم ہیں تو آشیاں ہیں مگر آشیاں سے دُور

داغِ دل و جگر کی نوازش نہ پوچھیے
یہ گلستاں ہے رسمِ بہار و خزاں سے دُور

پہنچے ہیں اس مقامِ محبت پہ ہم کہ اب
سجدہ نہیں روا ہے ترے آستاں سے دُور

دیر و حرم کو چھوڑ بھی آگے نظر بڑھا
حدِ نظر ہے وسعتِ کون و مکاں سے دُور

جورِ فلک نے خاک نشینوں میں کر دیا
ہم سے زمیں ہے دُور نہ ہم آسماں سے دُور

گھیرا ہے اُن کی مانگ کو زلفوں نے کس طرح
یہ شب کی ظلمتیں رہیں کیوں کہکشاں سے دُور

ہے ہر طرح سے عشق میں مٹی سحرؔ خراب
کوئے بتاں میں چین نہ کوئے بتاں سے دُور

سحرؔ بیدی

غزل

تیری قربت باعثِ ویرانئ دل ہوگئی
شمع کے جلتے ہوئے، اندھیر محفل ہوگئی

اپنی بربادی کا اب احساس تک جاتا رہا
تیری مرضی جب مری قسمت میں شامل ہوگئی

موت ہے تیرا تغافل، اے نگاہِ زخم ساز
اب تو بے چینی مری فطرت میں شامل ہوگئی

خوش گمانی پر مری تجھ کو ملا یہ حکمِ دوست
اب تری امید ٹوٹ جانے کے قابل ہوگئی

رحم کر میرے گدازِ قلب پر اے چشمِ حسن
تیری پہلی ہی نظر جزوِ رگِ دل ہوگئی

ہوگئی آخر کو تکمیلِ بہارِ جاوداں
جب نگاہِ عشق اس جلوے میں شامل ہوگئی

دوست کیا سحر خوش مری حالت پہ دشمن رو دیئے
زندگی اب پیار کرلینے کے قابل ہوگئی

آغا سحر خوش قزلباش

غزل

میری بیداری پہ صدقے گریۂ احباب تھا | کس طرح کہہ دوں کہ میں نے جو بھی دیکھا خواب تھا
ہائے وہ عہدِ جوانی جب سکوں نایاب تھا | دل کا ہر گوشہ اِک شعلۂ بیتاب تھا
بے سر و سامانیوں کے بعد دنیا کچھ نہ تھی | بے سر و سامانیوں تک عالمِ اسباب تھا
ہر دریچے سے نظر آیا رخِ نیکوئے دوست | جس طرف اٹھی نگاہیں گلستاں کا باب تھا

وہ ادائیں تھیں کہ امواجِ نشاطِ بیخودی
وہ تبسم تھا کہ طوفانِ شرابِ ناب تھا

دو دلوں کو پاس لے آئی تھی ٹھنڈی چاندنی | خواب ہی تسلیم کر لیجے تو اچھا خواب تھا
مل رہی ہے اب زمانے سے ہمیں دادِ وفا | ساغرِ الفت اچھوتا ہی نہیں نایاب تھا
آپ کی تشریف ارزانی نے رونق بخش دی | آپ سے پہلے ہی منظر مجھ کو غم تاب تھا
چشمِ عشوہ بیں سے بچ کر جیسے ملتی تھی نظر | تجھ پہ تھے محروم وہ دورِ شرابِ ناب تھا

آنکھ سے پڑنے سے دامن تک ڈھلک آنے پہ شادؔ
کون کہہ سکتا ہے یہ موتی کہاں بے آب تھا

شاد عارفی

غزل

رہ کے میں زمانے میں دور ہوں زمانے سے
رنگِ رُخ نکھر آیا بارِ غم اُٹھانے سے

ربط ہی نہیں جس کا اب کوئی زمانے سے
کیوں اُسے اٹھاتے ہو اپنے آستانے سے

ہجر کی کٹھن راتیں جاگ کر گذاری تھیں
موت آ گئی آخر نیند کے بہانے سے

رہ چکے بہت برہم آؤ اب گلے مل لیں
راہ و رسم بہتر ہے رنجشیں بڑھانے سے

دوستوں کو بھی دیکھا، دشمنوں کو بھی سمجھا
اب کہیں نکل چلیئے دُور اس زمانے سے

ان کا نام سنتے ہی چشمِ شوق بھر آئی
اور ہو گیا افشا رازِ دل چھپانے سے

وہ خفا سہی لیکن شوقِ دیدار سے توبہ
ان کو دیکھ آتا ہوں اک نہ اک بہانے سے

التماسِ غم سُن لو کیا تمہیں نہیں معلوم
دل بھی ٹوٹ جاتا ہے اس ٹوٹ جانے سے

قید و بند کی راحت اُس اسیر سے پوچھو
جو قفس میں خود آئے اُڑ کے آشیانے سے

اُف وہ پیار کی باتیں، ہائے وہ حسیں راتیں
کیا نہ مجھکو یاد آیا اُن کے یاد آنے سے

مجھ کو دے گی کیا جنبش اب روش زمانے کی
اپنے ساتھ انہیں لے کر ہٹ گیا زمانے سے

حُسنِ بے نہایت کی ہر جگہ حکومت ہے
عرش بھی نہیں محفوظ عشق کے نشانے سے

اک نگاہِ برہم کے ساتھ ساتھ چلتا ہے
گردشیں زمانے کی چھین کر زمانے سے

عالمِ محبت کا حال کیا کہوں شعری
ہر طرف اداسی ہے دل کے ڈوب جانے سے

شعری بھوپالی

غزل

اب دل ہے تیرے غم کا سہارا لئے ہوئے
قطرہ ہے اپنے ظرف میں دریا لئے ہوئے

اک میں ہی کیا ہوں آپ بھی مجبورِ عشق ہیں
ظاہر میں اختیار کا پردا لئے ہوئے!

کس کو یقین آئے قیامت کی بات کا
بیٹھے رہیں وہ وعدۂ فردا لئے ہوئے

میں غم کی وادیوں سے گذرتا چلا گیا!
تیری عنایتوں کا سہارا لئے ہوئے

میرے لئے فراق کی شب بھی ہے تابناک
پھرتا ہوں شمعِ داغِ تمنا لئے ہوئے

دیکھے وہ تجھ کو کیا جو تری بزمِ ناز میں
بیٹھا ہو چشمِ شوق کا پردا لئے ہوئے

ہم تاجدارِ عشق ہیں دنیا سے کام کیا
دنیا کے لوگ ہیں غمِ دنیا لئے ہوئے

صابر وہ بے نیازِ تمنا ہیں آج بھی
جب میں ہوں اضطرابِ تمنا لئے ہوئے

صابر دہلوی

غزل

اُف وہ رنگیں شباب آنکھوں میں
اک بہکتا سا خواب آنکھوں میں

میکشوں میں یہ دھوم ہے کہ پیو
وہ گلابی شراب آنکھوں میں

زاہدوں کو بھی شوق اُٹھا کہ پئیں
جب سے دیکھی شراب آنکھوں میں

دل میں ہنگامہ کر گیا برپا
وہ مچلتا شباب آنکھوں میں

تارِ سب دل کے جھنجھنا اُٹھے
اف وہ رنگیں رباب آنکھوں میں

جب سے میخانہ چھٹ گیا افسوس
خوں ہے دل میں نہ آب آنکھوں میں

اس پہ سنلو شوخیاں نثار ضیا
وہ جو ہے اک حجاب آنکھوں میں

ضیاءالاسلام

غزل

غیب سے ہو ہی جائے گی تائید
آپ کرتے رہیں مری تردید

آرزو کا بدل گیا مفہوم
خوب کی خوب یاس نے تنقید

پھر ہوا ختم ان کا عہدِ وفا
پھر مرے شوق کی ہوئی تجدید

اس کی تکمیل اور کون کرے
جس فسانے کی تجھ سے ہے تمہید

ہاں ٹھہر اے اجل کہ آ پہنچی
اُن کے آنے کی جاں نواز نوید

زندگی تجھ سے ہے سکوں تجھ سے
تو مری جان تو مری امید

خود ہی آ اور کوئی نوید نہ دے
تجھ سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی نوید

رمضاں سال بھر جو تم نہ ملو
تم جو مل جاؤ پھر ہے عید ہی عید

جس نے دیکھا اُسے وہی جانے
کیا کہیں عرشؔ فرقِ دید و شنید

عرشؔ ملسیانی

غزل

سیاروں کی تقدیریں ہیں جاگ رہی ہے
سوتے ہیں نہ افلاک زمیں جاگ رہی ہے

تارے بھی ہیں بیدار زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

اک عالم نیرنگ ہے دنیائے محبت
سوتی ہے کہیں اور کہیں جاگ رہی ہے

ہیں خواب میں عشاق مگر یاد کسی کی
یا دل ہی میں یا دل کے قریں جاگ رہی ہے

کروٹ سے شب ماہ میں بہتی ہے یہ گنگا
یا حسن کی بل کھائی جبیں جاگ رہی ہے

اقرار کی ٹھنڈک میں ہے انکار کی گرمی
سائے میں تری "ہاں" کے "نہیں" جاگ رہی ہے

آہوں سے کہو رات کا دل چیرتی جائیں
تاثیر سرِ عرش بریں جاگ رہی ہے

شبخوں نہ مہ نو سے ہو عشاق پہ اے چرخ
یہ رات لئے خنجر کیں جاگ رہی ہے

سونی ہے جہاں عشق کی تقدیر ازل سے
وہ نرگس بیمار وہیں جاگ رہی ہے

یہ رات اندھیری ہے مگر اے غم فردا
سینوں میں ابھی شمع یقیں جاگ رہی ہے

چھیڑیں تو تری سادگی حسن کو سو بار
لیکن نگۂ شوخ تریں جاگ رہی ہے

کچھ رات رہے آج ترے خواب کا عالم
یا سر بسر اک صبح حسیں جاگ رہی ہے

یہ نکھری ہوئی رات فراق آنکھ تو کھولو
سوتا ہوا سنسار نہیں جاگ رہی ہے

فراق:- گورکھپوری

غزل

مصیبتوں کی موجِ پُرخطر سے کھیلتا ہوا
اُلجھ پڑا طلسمِ بحر و بر سے کھیلتا ہوا

جہادِ زندگی میں ہوں، میں خود کو یوں لئے دیئے
رواں دواں ہوں موجِ خیر و شر سے کھیلتا ہوا

ترقیوں کی راہ میں، بشر ہے آج گامزن
عناصرِ حیات خشک و تر سے کھیلتا ہوا

لگا کے ایڑ کارگاہِ کُن میں ہوں رواں دواں
رکابِ ابلقِ شب و سحر سے کھیلتا ہوا

بلند کر کے نعرۂ پیامِ انقلاب میں
چلا ہوں آج شعلۂ و شرر سے کھیلتا ہوا

رسوم و قید سے بلند، مسلکِ خواص ہے
میں سجدہ کر رہا ہوں طاق و در سے کھیلتا ہوا

اب اس کو آپ اشتراکیت کہیں کہ دہریت
ہوں مبتدا سے بے خبر، خبر سے کھیلتا ہوا

کسی کی مفلسی ہی ہیں، شکوۂ قیصری بھی ہے
کوئی ہے اپنے زعمِ زور و زر سے کھیلتا ہوا

فریبِ چشمِ یار کو، سمجھ رہا ہے ناسمجھ
جگر کو دیکھتا ہوا، نظر سے کھیلتا ہوا

جنوں میں پرتوِ خرد، خرد میں پرتوِ جنوں
میں بے نیازِ "نقد" ہوں، نظر سے کھیلتا ہوا

دلِ غریب و ناتواں، بڑھا ہی جا رہا ہے پھر
قدم قدم، نفس نفس، نظر سے کھیلتا ہوا

رہِ امید و یاس میں دھواں سا اُٹھ رہا ہے کچھ
کہ قافلہ ہے گردِ رہگذر سے کھیلتا ہوا

زہے وجودِ بال و پر، خوشا حیاتِ عنصری
میں اُڑ رہا ہوں مشتِ بال و پر سے کھیلتا ہوا

مشاعرے میں فرحتِ حزیں کا ذکر ہی نہ کر
ہے ایک مردِ بے ہنر، ہنر سے کھیلتا ہوا

فرحت کانپوری

غزل

فریبِ دیر و حرم میں آکر طوافِ جام و سبو نہ کرنا
گناہ ہے رندِ مشربی میں گناہ کی آرزو نہ کرنا

بیاں سے کیا خاک شدتِ سوزِ غم کا اندازہ ہوسکیگا
گذارشِ حالِ واقعی ہے مریض کا گفتگو نہ کرنا

اگر تجھے گلستانِ ہستی میں بے پر و بال کی ضرورت
تو شاخِ دل پر کبھی مرتب نشیمنِ رنگ و بو نہ کرنا

طلوع ہوتا ہے آفتابِ خودی گریبانِ بیخودی سے
تجسسِ عقل گمرہی ہے تو بھول کر جستجو نہ کرنا

ہوس کی رائے میں شکستِ خودی کہ توہینِ بے نیازی
عقیدۂ عشق میں تو لیکن حرام ہے آرزو نہ کرنا

یہیں سے اک روز آفتابِ حیاتِ نو پھر طلوع ہوگا
اگر وہ تارِ نظر بھی بخشیں تو چاکِ دل تو رفو نہ کرنا

تری نگاہِ کرم نے ہر انجمن کے آئیں بدل دیئے ہیں
کبھی خموشی ثواب تھی اب عذاب ہے گفتگو نہ کرنا

نماز کیا لغزشِ قدم بھی ہے مستجاب اس کی بارگہ میں
اگر میسر حضورِ دل ہو گناہ بھی بے وضو نہ کرنا

ہوائے سیرِ چمن مبارک، گذارشِ فیض اس قدر ہے
اسیرِ دامِ نگاہ ہو کر تو دل کو بے آبرو نہ کرنا

فیض جھنجھانوی

غزل

زمانے سے مہر و وفا چاہتا ہوں
ذرا دیکھنا کس سے کیا چاہتا ہوں

سُنے دل سے دل کی کہوں جس سے باتیں
وہ مونس وہ دردِ آشنا چاہتا ہوں

نہیں شوخ چشمی یہ جوشِ فنا ہے
کہ تجھ سے تجھے اے خدا چاہتا ہوں

یہ حسنِ طلب بھی ہے کیا لذت آگیں
جو کوئی نہیں چاہتا۔ چاہتا ہوں

منور منور درخشاں درخشاں
دل و دیدہ طور آشنا چاہتا ہوں

ہر اک شے میں حسنِ ازل گو ہے پنہاں
اُسی جلوہ کو برملا چاہتا ہوں

کہیں میں کہیں دل تو پھر کون جانے
وہ کیا چاہتا ہے میں کیا چاہتا ہوں

خودی جذب ہونے کو ہے بیخودی میں
کہ اپنے ہی میں گم ہوا چاہتا ہوں

میرے ذوق میں ہے لطافت پسندی
نہیں حسن، حسنِ ادا چاہتا ہوں

زباں سے زمانے کی بچنے کو کیفی
میں اک کفر ایماں نما چاہتا ہوں

کیفی دہلوی

غزل

افسوس اب وہ لذتِ حسنِ سحر نہیں
دل کو یقین ہے کہ دعا میں اثر نہیں

یہ اور بات ہے کہ توجہ نہ کر سکے
ورنہ جو مجھ پہ گزری ہے تم کو خبر نہیں

جس کی خلش سے زندگیٔ دل جوان تھی
اب سینۂ حیات میں وہ نیشتر نہیں

جس کو گرا دیا نگہِ التفات نے
دنیائے اعتبار میں اُس کا گزر نہیں

اب وہ ہیں اور گیسو و رُخ کی تجلّیاں
نظروں میں میری جلوۂ شام و سحر نہیں

صرف ایک بار جس کو میں اپنی بھی کہہ سکوں
میرے نصیب میں کوئی ایسی سحر نہیں

اوروں نے بجلیوں کا بدن لے لیا مگر
او ناشناسِ وقت تجھے کچھ خبر نہیں

احساسِ کمتری ہی تباہی کا ہے سبب
فطرت کے ساتھ ساتھ مزاجِ بشر نہیں

گوہر کا صبر و ضبط نہ کھو اُن کے روبرو
کیوں اعتبار کھوتی ہے اے چشمِ تر نہیں

گوہر دہلوی

غزل

کچھ اس ادا سے خونِ تمنا کیا گیا
جیسے مری طرف سے تقاضا کیا گیا

سچ تو یہ ہے کہ غم ہی محبت کی جان ہے
تیرے لئے خوشی کو گوارا کیا گیا

میں اپنی غم پرست طبیعت کو کیا کروں
جب خود ہوا نہ درد تو پیدا کیا گیا

اُتنے ہی وہ گرفتِ نظر سے تھے دور دور
جتنا قریب جا کے نظارا کیا گیا

وہ ہنس دیئے کہ عرضِ تمنّا فضول ہے
میں اس خیال میں کہ اشارا کیا گیا

وہ خود بھی آپ اپنے ہی جلووں میں محو تھے
اُن کی نظر سے ان کا نظارا کیا گیا

ماہر القادری

غزل

مری وفا کا ترا لُطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں

مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں

یہاں تو حُسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پُوچھئے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

یہ کیا کہ عشق کا نالہ بھی بے نیازِ اثر
یہ کیا کہ حُسن کا افسوں بھی کامیاب نہیں
سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں
مجازؔ کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیابِ محبت بھی کامیاب نہیں

مجاز

غزل

ایسے میں خاک لطفِ فراوانِ زندگی
دستِ قضا ہے اور گریبانِ زندگی

شاداں ہیں جس پہ حلقہ بگوشانِ زندگی
کتنا حسیں فریب تھا فرمانِ زندگی

پاسِ ادب ہے ورنہ میں کہتا یہ برملا
بخشا ہے کیا عذاب بہ عنوانِ زندگی

برہم جو تو ہوا تو بنا حسنِ مطمئن
ہو کر رہیں گے کس کے پریشانِ زندگی

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، جبرِ روزگار
کس کس کے ہاتھ میں ہے گریبانِ زندگی

اک بارِ کائنات ہیں دم پر لیئے ہوئے
کتنے جری ہیں درد نوازانِ زندگی

اس کے لئے ہے محشرِ تازہ ہر ایک سانس
جس بد نصیب کو ہوا عرفانِ زندگی

یہ بزمِ دلفریب ہے کانٹوں کی رہگذر
نازاںؔ بچا کے چل یہاں دامانِ زندگی

نازاںؔ لطیف دہلوی

غزل

کوئی کس طرح رازِ الفت چھپائے　　نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے
وہ مجبوریوں پر مری مسکرائے　　یہاں تک تو پہونچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی تھے
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتا　　بہت اشک روکے بہت مسکرائے
وہ اس طرح میرے برابر سے گذرے　　ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

زمانے کے جور و ستم توبہ توبہ
کہ اکثر تو مجھ کو نہ تم یاد آئے

ترے روبرو گر نظر مطمئن ہو　　تو سینے میں دل بھی دھڑکنے نہ پائے
ہیں اس احتیاطِ نظر کے تصدق　　نہ بہکیگا نہ سمجھے نہ اپنا بنائے

یہی تو جواب شکایت تھا نخشب
مرے شعر اس نے مجھی کو سنائے

نخشب جارچوی

غزل

کروٹیں وقت کی بیکار ہوئی جاتی ہیں
اور بھی درپئے آزار ہوئی جاتی ہیں

کس کے انفاس میں پنہاں ہیں بہاروں کے ہجوم
کونپلیں پھوٹ کے گلزار ہوئی جاتی ہیں

گتھیاں ولولۂ شوق کی سلجھیں کیونکر
جتنی کھلتی ہیں پُر اسرار ہوئی جاتی ہیں

نت نیا درد ۔ نئی آس ۔ نیا بہلاوا
گردشیں میری خریدار ہوئی جاتی ہیں

ہر تقاضے پہ نیا ضابطہ رہتا ہے سوار
روحیں لفظوں میں گرفتار ہوئی جاتی ہیں

شاید اب عشق ہے نومیدئ جاوید کا نام
آنکھیں رونے کی گنہگار ہوئی جاتی ہیں

شاید اب ابر کے چھٹنے کا گماں باطل ہے
صبحیں ہم رنگِ شبِ تار ہوئی جاتی ہیں

جن صداؤں کے لئے گوش برآواز تھا دہر
اصطلاحوں میں گرفتار ہوئی جاتی ہیں

آرزوؤں کو ہے اب اُن سے شکایت یعنی
آزمائش کی سزاوار ہوئی جاتی ہیں

اتنی ہلکی ہے شبستانِ محبت کی ہوا
میری سانسیں بھی مجھے بار ہوئی جاتی ہیں

اب لپکتی ہوئی کشتی کا سنبھلنا معلوم
پھر چٹانیں سی نمودار ہوئی جاتی ہیں

ان کے ہالے میں کہیں میرا نشیمن تو نہ تھا
بجلیاں کس کی پرستار ہوئی جاتی ہیں

منزلیں دور سہی، راہنما چور سہی
لغزشیں قافلہ سالار ہوئی جاتی ہیں

تشنہ کامی کا یہ عالم ہے کہ میری نظریں
جس قدر تھکتی ہیں سرشار ہوئی جاتی ہیں

ضبطِ فریاد کا شاید ہے یہ انجام ندیمؔ
میری خاموشیاں گفتار ہوئی جاتی ہیں

احمد ندیم قاسمی

غزل

کب ہوا تاراجِ برقِ بے اماں کیونکر ہوا
یہ نہ پوچھو مجھ سے برباد آشیاں کیونکر ہوا

جزو میں کیونکر الٰہی آ گئے اندازِ کل
قطرہ طوفاں زارِ بحرِ بیکراں کیونکر ہوا

اُن کا جلوہ تو ازل سے ہے حجاب اندر حجاب
باعثِ ہنگامۂ کون و مکاں کیونکر ہوا

جس کی ماہیت سے ہے ذہنِ ملائک بےخبر
آشنا اُس راز سے پیرِ مغاں کیونکر ہوا

اے کہ تیرا حسن میرے دل میں ہے خلوت نشیں
برگ برگِ لالہ و گل سے عیاں کیونکر ہوا

ایک مشتِ خاک سے افزوں نہیں میرا وجود
سوچتا ہوں حاملِ بارِ گراں کیونکر ہوا

میں کہ تھے ہفت آسماں چکر میں نسبت سے مری
پائمالِ گردشِ ہفت آسماں کیونکر ہوا

میں کہ تھی میرے لئے پہنائی افلاک تنگ
حیرتی ہوں قانع یک خاکداں کیونکر ہوا

میں کہ تھی تخلیق میری خواجگی کو دہر کی
پائے بندِ احترامِ این و آں کیونکر ہوا

تھا میں صحرائے عدم میں صورتِ کنزِ نہاں
عالمِ ہستی میں خاکِ رائیگاں کیونکر ہوا

بھا گئی کیوں فطرتِ آزاد کو پابستگی
آدمی مانوسِ زنجیرِ گراں کیونکر ہوا

اصل ہی جب کچھ نہیں سود و زیانِ دہر کی
گرم یہ ہنگامۂ سود و زیاں کیونکر ہوا

سازِ گیتی میں نہیں گر غیر از آہنگِ حق
ملتوں میں فرقِ ناقوس و اذاں کیونکر ہوا

تو کہاں اے غیرتِ مہرِ درخشاں ہم کہاں
خاکساروں پہ محبت کا گماں کیونکر ہوا

جانتے تھے اہلِ تقویٰ نے تجھے ہم اے نہالؔ
یہ بتا سرخیلِ رندانِ جہاں کیونکر ہوا

نہالؔ سیوہاروی

غزل

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنارِ دوست
قایم رہے کہیں، خلشِ انتظارِ دوست

اک گونہ دل کو میرے سکوں ہو چلا تھا، پھر
یہ تو نے کیا کیا، نگہِ بے قرارِ دوست

سب شکوے دل کے مٹ گئے بس اک جواب میں
اُف رے، فریبِ وعدۂ ناستوارِ دوست

غربت کے دن بھی کٹ ہی گئے، خیر، شکر ہے
اچھا، مرا سلام لے، یادِ دیارِ دوست

یاں ہر خلش، جنوں کدۂ اضطرابِ دل
واں، ہر نگہ کرشمۂ بے اختیارِ دوست

اے وائے، صد ہزار تمنائے مضطرب
خلوت میں بھی وہی ہے فریبِ قرارِ دوست

گو ہم نے لاکھ کام لیا ضبط سے نیازؔ
پہچان ہی گئی نگہِ ہوشیارِ دوست

نیاز فتحپوری

غزل

وہ عہدِ مسرت کی باتیں وہ وقت سہانا بھول گئے
جب سے غمِ دنیا یاد آیا سب لطفِ زمانا بھول گئے
خاموش ہے گو بزمِ الفت جاتی ہی نہیں دل کی وحشت
جس شمع کی ضو تھی محفل میں وہ شمع بجھانا بھول گئے
تنظیمِ گلستاں کی دھن میں اب شاخِ نشیمن یاد نہیں
اے گردشِ دوراں خوش ہو لے ہم اپنا ٹھکانا بھول گئے
جب ہنسنے ہنسانے کے دن تھے ہم آٹھ پہر روتے ہی رہے
اب وقت جو آیا رونے کا ہم اشک بہانا بھول گئے
اندوہ کی ماری دنیا میں کچھ اپنی زباں سے کہہ نہ سکے
اوروں کے فسانے سن سن کر ہم اپنا فسانا بھول گئے
اے بربطِ جاں دکھ سہنے دے بیخوابِ شبستاں رہنے دے
جس گت پہ ہمیں نیند آتی تھی وہ گت ہی بجانا بھول گئے
اے تندیِ صہبا دشمنِ غم کیفیتِ عالم دیکھ کے ہم
شیشہ کو لگا کر ہونٹوں سے پھر اس کو ہٹانا بھول گئے
اک شور مئے و مینا لے کر ہم ٹوٹ پڑے انگاروں پر
ہشیار بنا کر دنیا کو خود ہوش میں آنا بھول گئے
اس دورِ تلاطم میں واثق کتنے ہی سفینے کھے ڈالے
اور ٹوٹی ہوئی کشتی اپنی موجوں سے بچانا بھول گئے

واثق:- بی اے

غزل

جمودِ آب و گل جو ہے وہ جاتا ہے کہاں مجھ سے
عبث فریاد کرتا ہے درائے کارواں مجھ سے

نظر نظارہ خو میری جبیں ہنگامہ جو میری
نمایاں ہے مرا شوقِ سجود آستاں مجھ سے

مرے دل نے مری آنکھوں سے رکھا تجھ کو پوشیدہ
تری جب بات آئی رک گئی میری زباں مجھ سے

تم اپنی انقلاب انگیزیوں کی داستاں سن لو
اگر سن لو کسی دن آ کے میری داستاں مجھ سے

خبر کس کو نہیں ہے تیری شانِ بے نیازی کی
نہیں معلوم پھر کیوں ہے زمانہ بدگماں مجھ سے

کسی صورت قفس میں زندگی اپنی گذر جاتی
سلوک اچھا نہیں کرتی ہے یادِ آشیاں مجھ سے

سرِ محفل چرانا آنکھ کا تھا ایک افسانہ
وہ تو نے کہہ دیا خود جو نہ ہوتا تھا بیاں مجھ سے

نیازِ بندگی کو دیکھ کر یہ شانِ استغنا
بتا کیا چاہتا ہے تیرا نازِ جانستاں مجھ سے

کیا تھا روحِ غالب سے جو میں نے کسبِ فن وحشت
سخنور سیکھتے ہیں آج اندازِ بیاں مجھ سے

وحشت کلکتوی

غزل

کیونکر یہ کہیں اس ظالم کے ظلم اور ستم ہم سہہ نہ سکے
لیکن اب یہ رات آہی گئی آخر ہم چپ بھی رہ نہ سکے

دل اور زباں پہ تالا لگایا۔ الفت کی نظر کیا چھپتی ہے
پُر شوق نگاہوں نے کہہ دی وہ بات جو منہ سے کہہ نہ سکے

عاشق کو جو مطلب تھا سمجھ گیا۔ الفت کو سکوں کیا لب تک
جذبات میں کشتی غافل ہے جو جذبات کی رو میں بہہ نہ سکے

اشک آتے تمہاری آنکھوں میں دنیا تہ و بالا ہو جاتی
اچھا ہی ہوا افسانۂ غم تم سن نہ سکے ہم کہہ نہ سکے

بیماریٔ غم نے وقت سحر گل کر دی شمع حیات آخر
کیا کرتے ہم انساں ہی تو تھے یہ شب فرقت سہہ نہ سکے

سمجھے تھے بہت کچھ کہنا ہے کہنے کی بہت سی باتیں ہیں
وہ آئے بھی اور چل بھی دیئے کچھ منہ سے مگر ہم کہہ نہ سکے

دشمن کو وفا سے کیا نسبت گھبرائے ہوئے کیوں پھرتے ہو
آجاؤ ہماری آنکھوں میں گر غیر کے دل میں رہ نہ سکے

تنگ آ کے تمناؤں سے وفا اب چاہتا ہوں دل میں اپنے
کوئی بھی تمنا آ نہ سکے کوئی بھی تمنا رہ نہ سکے

مہیپال گپتا وفا

سنہ ۴۳ء

کی

معیاری نظمیں

کنول کا پھول

(ایک تمثیل)

تو پھول ہے کنول کا اسرار کا خزانہ
تیرا وجود گر نہ ہوتا اندھیر تھا زمانہ

پاکی و سربلندی تجھکو ہوئی ودیعت
اے سرخوشِ حقیقت اے دلبرِ یگانہ

ایک ایک پنکھڑی میں ہیں جمع حسن لاکھوں
موجِ ہزار نغمہ ترتیبِ صد ترانہ

بادِ سموم تجھکو چھو لے مجال کیا ہے
تیری بہار دائم اے نقشِ جاودانہ

طوفان سر سے گذریں کھائے نہیں تھپیڑا
پر اضطراب تیرا ان جانے کا فسانہ

اللہ رے پائداری قائم ہے تو جہاں تھا
کیا کیا نہیں نکالا کیا کیا نئے شاخسانہ

تیری جڑیں دراتیں خود وقت کے جگر میں
خود وقت گھل گیا ہے تمکین کا فسانہ

بھونروں کے غول آئے اُڑ کر کہاں کہاں سے
تھے جن کے ہونٹ پیاسے ... رس سے ہوئے نہ بھیگے

وحشی ہوائیں دوڑیں نفرت کا زہر لیکر
دیتی ہوئی تھپیڑے معجز نما علو کو

رعنائی ابد کی رنگینیاں جھلسنے
شعلوں کی مار کرنے شادابیِ نمو کو

چاہا کہ پھر نہ اُبلے چشمہ شگفتگی کا
پھنکار کر دے ٹھنڈا کھولے ہوئے لہو کو

حیلے تراشے کیا کیا عزت کے ہو کے درپے
انجام کار خود ہی کھو بیٹھے آبرو کو

چالیں کھپائیں کیا کیا پایا نہ بھید تیرا
ٹکرائی چال والے نکلے تھے جستجو کو

ہو تربیت میں جس کی روحِ دوامِ شامل کیا واسطہ فنا سے اُس جانِ آرزو کو
ہر چند تو ہمیشہ سچ اور شانتی کا پیغام لحظہ لحظہ دیتا رہے عدو کو
لافانیت کی مورت، انسانیت کے دیوتا تجھ سا جو خود نہیں ہے کیا سمجھے تیری خو کو

اپنا ہوا نشانہ ہر شاطرِ زمانہ
تو پھول ہے کنول کا اسرار کا خزانہ

اثر لکھنوی

زلزلے کے دیوتا سے

اے رجز خوانِ تغیر شہسوارِ انقلاب
تیری ہر موجِ تنفس ہے شرارِ انقلاب

کیسے کیسے کر رہے ہیں اہلِ زر اعمال دیکھ
ہو رہی ہے کس طرح انسانیت پامال دیکھ

محفلِ عالم پہ ہے اندھیر پرخاش و کیں
میں سمجھتا ہوں کہ تیرے کان ہیں آنکھیں نہیں

نبضِ انساں میں مروت کا لہو باقی نہیں
دوستوں میں اب وفاداری کی خو باقی نہیں

برہمن زادوں کو تو قبرستاں پر اعتراض
خاک کے پتلوں کو خلاقِ جہاں پر اعتراض

منزلِ اخلاص میں ہے مکر و فن کی رہبری
چھڑ رہی ہے امن کے پردے میں جنگِ زرگری

قلبِ انساں نے وہ استبداد کا پکڑا ہے رنگ
دیکھ کر جس کو گڑے جاتے ہیں غیرت سے پلنگ

تیرہ کاری سے ضمیروں پر اندھیرے چھا گئے
دشمنی کے فرض رسمِ دوستی میں آ گئے

فتنے برپا ہیں سیاست کے جنونِ خام سے
بڑھ رہی ہے برہمی تنظیمِ نو کے نام سے

تلخیاں ہیں روح میں زہرابۂ آلام کی
صبح کے رخ پر جھلکتی ہے سیاہی شام کی

سینۂ انصاف اپنی تابناکی کو چھپا
سادہ کارانِ تمدن کا طمع ہو چکا

نیکیوں کی راہ میں بدکاریوں کی بھیڑ ہے
عقل کے جھنڈے تلے عیاریوں کی بھیڑ ہے

ضو نہیں ایماں کی انساں کے دلِ گمراہ میں
لاکھ شیطانوں کے پہرے ہیں خدا کی راہ میں

پشتِ مذہب پر وہ کفر و افترا کا بار ہے
ریڑھ کی ہڈی چٹخنے کے لئے تیار ہے

اب سیاست ہے نہ مذہب ہے نہ رہبر ہے نہ راہ
جس طرف جاؤ شقاوت جس طرف دیکھو گناہ

دیکھ انسانوں کا دل لرزے زمانہ ہو گیا
کوئٹہ کا قصۂ خونیں پرانا ہو گیا

اُٹھ ذرا اگاہ زمیں کو لیکے دو اک گام چل
غیرتِ احساس بھی کچھ چاہیے کروٹ بدل

کیا ہے تیرے سامنے سرمایہ داری کی اساس
خونِ دولت سے بجھاتے ہوئے ذروں کی پیاس

اُن کے گردوں بوس محلوں کو اُلٹ کر ڈال دے
قبر کے سانچوں میں اُن کی زندگی کو ڈھال دے

کھولتے لاوے میں سامانِ طرب بہنے لگے
شورشِ ہستی عدم کی داستاں کہنے لگے

اُن کے لاشے لائقِ گور و کفن ملنے نہ جائیں
اُن کے چہرے اس طرح بگڑیں کہ پہچانے نہ جائیں

روئی کی صورت دُھنک کر نرم کر دے کوہسار
خاک میں روپوش ہو جائیں لہکتے لالہ زار

[illegible] سارے اس طرح بنیاد سے [illegible]
جس طرح کٹ کر ہوا میں ڈگمگاتی ہیں پتنگ

فرشِ خاکی سے یہ [illegible]
اُن کے ایوانوں پہ [illegible] کے جھنڈے گاڑ دے

خوف کے مارے [illegible]
[illegible] خاک کے ذرے [illegible]

[illegible]
آئینہ خانے [illegible] پھرنے لگیں

سرخ تعمیریں نظر آنے لگیں اینٹوں کے ڈھیر
کانپ کر لپٹیں در و دیوار سے در کے ذرے [illegible]

کوہ ٹکرائیں مکانوں سے مکاں لڑنے لگیں
صاف میدانوں کی پیشانی پہ بل پڑنے لگیں

لے چلیں میت درختوں کی بگولے دوش پر
ناز ہو تخریب کو اس منظرِ خاموش پر

چوٹیاں جھک جھک کے غاروں سے ملاقاتیں کریں
سر اُٹھا کر پست میداں افلاک سے باتیں کریں

تند ژالے بڑھیں ہیبت بڑھانے کیلئے
راستے منہ کھول دیں رہرو کو کھانے کیلئے

انجمادِ آب و گل کی بندشیں کھلنے لگیں
بحر یوں چھلکیں کہ کہساروں کے منہ دھلنے لگیں

شہر میں بربادیوں کی دیویاں گاتی پھریں   بجلیاں تاریکیوں میں شمع دکھلاتی پھریں
آندھیاں غرّائیں ٹیلوں کو اُڑانے کے لئے   دانت پیسیں گھاٹیاں پتھر چبانے کے لئے

موت بھی تھک جائے روحوں کو صدا دیتے ہوئے
آسماں دیکھے زمیں کو کروٹیں لیتے ہوئے

احسان دانش

شہرت

یہ ہلکے پر لگا کر کون اُڑتا ہے ہواؤں میں
یہ کس کا نقش روشن ہو گیا رنگیں فضاؤں میں

سفر بڑھتا ہے جتنا قوتِ پرواز بڑھتی ہے
یہ ندی وقت کے دھارے پہ آ کر اور چڑھتی ہے

یہ بے پروا ہے گو لوگ اس کو خاطر میں نہیں لاتے
حسد کے تیر چلتے ہیں مگر اس کو نہیں پاتے

خرد کی راہ میں شمعیں جلا کر بڑھتی آتی ہے
مہی کی دھوپ ہے جو بے محابا چڑھتی آتی ہے

چٹانوں کے کلیجے پر قدم اس کا پڑا ہوگا
خیالوں کی بلندی پر علَم اس کا گڑا ہوگا

جہالت کے اندھیرے سے گزرنا ہی پڑا ہوگا
تغافل کا بیاباں پار کرنا ہی پڑا ہوگا

دیا ہوگا کہیں تنقیدِ جائز کو خراج اس نے
کہیں تعریف کے پھولوں کا پہنا ہوگا تاج اس نے

اسے تدبیر کے رنگین شعلوں نے ہوا دی ہے
اسے تقدیر نے گھبرا کے بڑھنے کی رضا دی ہے

کبھی ایثار کی منزل کبھی میدانِ جنگ آیا
بڑی قربانیوں کے بعد آنکھوں میں یہ رنگ آیا

رواں ہے اس کی موجِ ناز بحر و بر کے سینہ پر
مشقت کا پھریرا نصب ہے اس کے سفینہ پر

کبھی پُرشور طوفانوں کے ہیبت ناک تلاطم میں
کبھی مثلِ نظر رقصاں دیارِ ماہ و انجم میں

مشقت ہی کے زانو پر اسے آیا تو خواب آیا
کشاکش میں حیات و موت کی اس کا شباب آیا

فنا پر یا تمامی میں گھٹا جاتا تھا دم اس کا
جنونِ شوق نے آخر کیا اونچا علَم اس کا

کسی فنکار کی یا ماہرِ حکمت کی کاوش ہے
کسی کی زندۂ جاوید بن جانے کی خواہش ہے

احتشام حسین

۵۹

مولینا کی قیام گاہ

کیا حرج ہے جو قبلۂ عالم سے پوچھیے — تجویز کی ہے آپ نے کیوں یہ قیامگاہ
ہر ہر قدم پہ چین ہیں ہے لغزش کا احتمال — ہر گام پہ ہے جس میں تصادم کا اشتباہ
اِک سمت ساحرانِ سینما کہ ہائے ہائے — اِک سمت کافرانِ کلیسا کہ آہ آہ
آتش فروز ایک طرف حُسنِ پارسی — کج اک طرف یہود کے انداز کی کلاہ
تیرِ نگاہ ناز کا ہر وار بے خطا — تارِ کمرِ زلف کا ہر پیچ بے پناہ
القصہ تحت و فوق چپ و راست پیش و پس — فتنوں کا ایک جال بچھا ہے پئے نگاہ
پھر طرفہ یہ ہے کہ راہ میں اس درجہ پیچ و خم — بیچارے دل کو بھاگنے کی بھی ملے نہ راہ

معلوم ہے جناب کہیں گے جواب میں — اپنی تو ختم ہو بھی چکی قوّتِ نگاہ
لیکن خطا معاف سبھی آپ سے نہیں
آنکھیں بھی لے کے آتے ہیں خدّامِ بارگاہ

احمقؔ پھپھوندوی

غلامی

آجکل انکارِ آئینِ حقیقت کا ہجوم — علم و دانش کے یہ نغمے دعوئ ترکِ رسوم
مشرقی تہذیب سے اِس درجہ گہرا اختلاف — عقلِ انسانی کی بیداری کا ایسا اعتراف
اہلِ مشرق کے تمدن پر جراحت اس قدر — جیسے یاں تھی ہی نہیں گنجائشِ علم و ہنر!
سیرتِ مذہب، خدا اور روح سے بیزاری — یہ سرورِ پختہ کاری یہ غرورِ ہمسری!

تو اسے سمجھا نہیں اب تک عجب ثم العجب!
ہمنشیں سُن میں بتاتا ہوں تجھے اسکا سبب!

عجب ولعنت ڈال دیتا ہے جب آنکھوں پہ پردہ — دیکھتا ہے ذہنِ انسانی خداوندی کو خواب!
ابنِ آدم منتقل ہوتا ہے رہ و رسمِ حیات — شرع و آئین کیا ہیں اور کیسے اصولِ کائنات
خود ہی آخر بنا لیتی ہیں خود اپنے اصول — ہر نفس اک جرأتِ رندانہ و "شوقِ فضول"!
رفتہ رفتہ پھر یہ سمجھاتی ہے عقلِ ناتمام — دام اسکے ہاتھ میں ہو اور یہ دنیا زیرِ دام!

عشرتیں اب صرف رہ جاتی ہیں اُس کا مدعا!
اُس کی دنیا میں نہ مذہب اور نہ رہتا ہے خدا

اور اک عالم ہے اس عالم سے بڑھکر ہمنشیں — مرکزِ اوہامِ باطل، دشمنِ حسنِ یقین!
قوم جب کوئی رہے صدیوں غلامی میں اسیر — بجھ کے رہ جاتے ہیں ایسی قوم کے روح و ضمیر
عیب اس کو اپنی ہر اک شے میں آتا ہے نظر — خاک کے بکھرے ہوئے ذرے ہوں یا سلکِ گہر

یہ سکھاتی ہے غلامی کی سسکتی زندگی
اُسکی محفل کے چراغوں میں نہیں تابندگی

ختم اُسکی بزمِ عشرت کے فسانے ہوگئے
مے ہوئی بے کیف ظرفِ مے پرانے ہوگئے

اُس کے قصرِ زندگی کے مٹ گئے نقش و نگار
اُس کی سیرت کے چمن سے جاچکی فصلِ بہار

عیب و عصیاں سے پھر اُسکی آنکھ شرماتی نہیں
اُس کو اپنے میں کوئی خوبی نظر آتی نہیں

وہ پجاری بن کے رہجاتی ہے اُن اصنام کی
جن کے ہاتھوں ڈوبتی ہیں کشتیاں اقوام کی

ڈھونڈھتی ہے اپنے ہر قومی تصوّر میں قصور
اُس کی صبحِ زندگی کے رخ سے اُڑجاتا ہے نور

دوسروں کے نقص کو بھی وہ سمجھتی ہے کمال
ہے اسی ناکام دنیا میں زوال اندر زوال

کوئی تہذیب و تمدن کا نہیں رہتا نظام
مختلف دھاروں کے رخ بہتی ہے اُسکی طبعِ خام

ہمنشیں ہم پر یہی طاری ہے عالم آجکل
ظلمتوں کی رَو میں ہیں مشرق کے انوارِ عمل

وہ بھی کوئی قوم ہے جس کا نہ ہو کوئی اصول
ننگ ہے جو اغیار کی تقلید کا کرلے قبول!

جس زمیں پر پھول پیدا ہوں نہ بطنِ خاک سے
وہ زمیں معمور ہوتی ہے خس و خاشاک سے!

بجھ گئے جس کے ارادے چھن گئی جس کی نظر!
حیف ایسی قوم پر صد حیف ایسی قوم پر!!

علی اختر

اُجڑے ہُوئے پائیں باغ میں

(۱۵ سال کی مہجوری کے بعد)

پھر کھڑا ہوں یا دلِ سرشار، پائیں باغ میں — پھر بپا ہیں حشر کے آثار، پائیں باغ میں
پھر لپٹتے ہیں گلے اشجار، پائیں باغ میں — دیدۂ غمگیں ہے پھر خونبار، پائیں باغ میں
خوابِ طفلی ہوگیا بیدار، پائیں باغ میں!

ایک دن میرے لئے وادئ ایمن تھا یہ باغ — میں تھا ننھا سا کلیم اور طورِ روشن تھا یہ باغ
عہدِ طفلی ایک بُلبُل تھا، نشیمن تھا یہ باغ — شاعری کی اوّلیں کرنوں کا مسکن تھا یہ باغ
چارسو تھی بارشِ افکار، پائیں باغ میں!

ہر شجر تھا اس کا، اِک دن گُل بداماں تا کمر — جھولتی تھیں گلرخانِ خلد ساماں تا کمر
کاکُلِ پیچیدہ دربر، زلفِ رقصاں تا کمر — سب گلستاں تا بداماں سُنبلستاں تا کمر
پھول سے روشن کئے رخسار، پائیں باغ میں

آج وہ رنگِ گُل و حسنِ چمن باقی نہیں — نقشِ نسرین و نشانِ یاسمن باقی نہیں
نرگس و سوسن کی رنگیں انجمن باقی نہیں — موتیا کا روپ، چمپا کی پھبن باقی نہیں
ہے فقط رنجیاں جگر افگار، پائیں باغ میں!

ایکدن خوشبو کا طوفاں بن کے آتی تھی صبا — میکدے سے لاتی گھٹا، مستی لٹاتی تھی صبا
بلبلوں کے نغمے سُن کر رنگ لاتی تھی صبا — شاخِ گُل کے بربطوں پر گنگناتی تھی صبا
طائرانِ خلد کے اشعار، پائیں باغ میں!

شاخِ گُل کبھی کہ سایہ تک نہیں پاتی ہیں اب　　ننھی کلیوں کو عوض سپنے نظر آتی ہیں اب
چار سو صرصر کے جھونکے خاک برساتی ہیں اب　　تتلیوں کے بدلے برگِ زرد لہراتی ہیں اب
اور بجائے گل ہجومِ خار، پائیں باغ میں!

ایکدن کس درجہ بیخود ہو کے آتی تھی بہار　　عالمِ مستی میں کیا دھومیں مچاتی تھی بہار
رنگ و بو کی محفلوں میں مسکراتی تھی بہار　　چاندنی میں رات بھر گجرے بناتی تھی بہار
اور حسینوں کے گلے کے ہار، پائیں باغ میں!

آج ہیں نظروں سے غائب نازنینانِ چمن　　آہ وہ یارانِ گلشن ہم نشینانِ چمن
خاک کے پردے میں ہیں چار سو حسینانِ چمن　　ماہرویانِ چمن، زہرہ جبینانِ چمن
مٹ گئی وہ محفلِ انوار، پائیں باغ میں!

ایکدن ہر سمت امواجِ صبا تھیں رقص میں　　شاخسارِ نازک و رنگیں فضا تھیں رقص میں
حوریانِ غنچہ ہائے خلد زا تھیں رقص میں　　ننھی ننھی تتلیاں بھی جابجا تھیں رقص میں
رقص میں تھا سایۂ اشجار، پائیں باغ میں!

نونہالانِ گلستاں پر شباب آیا نہ تھا　　عشقِ پیچاں میں زیادہ پیچ و تاب آیا نہ تھا
یاسمن کی کاکلوں میں اضطراب آیا نہ تھا　　میں رہا جب تک کوئی بھی انقلاب آیا نہ تھا
بے اثر تھی وقت کی رفتار، پائیں باغ میں!

وقت کے ہمراہ لیکن وہ سماں جاتا رہا　　خوشنما پھولوں کا رنگیں کارواں جاتا رہا
وہ ہجومِ طائرانِ نغمہ خواں جاتا رہا　　میرے جاتے ہی فروغِ گلستاں جاتا رہا
خار و خس کے رہ گئے انبار، پائیں باغ میں!

جنّتِ طفلی کے وہ شیریں نظارے مٹ گئے
دل بہلنے کے جو ساماں تھے ہمارے مٹ گئے
نونہالانِ چمن جتنے تھے سارے مٹ گئے
وہ فضائیں وہ ابر، وہ گل، وہ ستارے مٹ گئے

رہ گئے بس چند ماتم دار پائیں باغ میں!

یادگار اُس عہدِ رفتہ کی ہیں چند اشجار ابھی
آہ اِس ویرانہ میں باقی ہیں کچھ غمخوار ابھی
بوڑھے ساونتوں پہ پیری کی نہیں آئی ہار ابھی
بیتہ بیتہ ہے لئے جلتی ہوئی تلوار ابھی

اب بھی ہیں پاسباں دو چار پائیں باغ میں!

یہ شجر وہ ہیں جو گودوں میں کھلاتے تھے مجھے
اپنے کندھوں پر محبت سے بٹھاتے تھے مجھے
میرے سر کو چومتے تھے، گدگداتے تھے مجھے
بوڑھے ہو کر جھولتے تھے اور جھلاتے تھے مجھے

میرے بچپن میں ہزاروں بار پائیں باغ میں!

السلام اے باغ کے بوڑھے جوانو السلام!
السلام اُجڑے چمن کے پاسبانو السلام!
عہدِ طفلی کے پرانے ہم زبانو السلام!
السلام اے عہدِ رفتہ کے فسانو السلام!

اب تمہی تم ہو مرے غمخوار پائیں باغ میں!

اختر شیرانی

میرا چراغ

زندگی کے خشمگیں طوفان میں
بحر برق و باد کے طغیان میں
موت کے ظلمت فزا میدان میں
جل رہا ہے دیر سے میرا چراغ

ظلمتوں میں ماہ پارے کھو گئے
کتنی کرنیں کتنے تارے کھو گئے
کتنے ظلمت میں شرارے کھو گئے
اور جلتا ہی رہا میرا چراغ

بدلیاں اٹھتی رہیں چھاتی رہیں
ظلمتیں ہر سمت منڈلاتی رہیں
آندھیوں پر آندھیاں آتی رہیں
تھرتھرایا تک نہیں میرا چراغ

اک دھوئیں کی لہر بل کھاتی رہی
ظلمتوں کے تیر برساتی رہی

سیم و زر کی آگ کجلاتی رہی
مسکراتا ہی رہا میرا چراغ
زندگی اک سیلِ خوں ہوتی گئی
اور تکمیلِ جنوں ہوتی گئی
تیرگی جتنی فزوں ہوتی گئی
جگمگایا اور بھی میرا چراغ

جاں نثار اختر

ایک مہ پارہ

مرے پڑوس میں رہتی ہے ایک مہ پارہ
سُرور و نُور و بہار و شفق کا گہوارہ

قریبِ شام وہ اپنا رباب اُٹھاتی ہے
تکلفات کے سارے حجاب اُٹھاتی ہے

حرم کے رسمی اصولوں کو توڑ دیتی ہے
کہ روحِ زیست کو آزاد چھوڑ دیتی ہے

صدائے ساز سے ملتی ہے اُس کی تیز آواز
وہ برق نما، تپش افروز، شعلہ ریز آواز

بلند ہوتے ہیں دل دوز نشتریں نغمے
خلش فزا، ستم آرا، مگر حسیں نغمے

سکوتِ شام کی چھاتی دھڑکنے لگتی ہے
فضا میں آگ سی ہر سُو بھڑکنے لگتی ہے

ہوائیں وجد میں آتی ہیں لے کے افسوں سے
ستارے جھانکنے لگتے ہیں بامِ گردوں سے

مرے پڑوس میں رہتی ہے اک مہ پارہ
سرود و نور و بہار و شفق کا گہوارہ

نہ ہو یہ رنگ یہ نزہت فضاؤں میں ہرگز
نہ ہو یہ کیف یہ مستی ہواؤں میں ہرگز
فلک کی بزم رہینِ تجلیات نہ ہو
اگر وہ نغمہ نہ چھیڑے تو رات رات نہ ہو

ستارہ خیز و نسیم آفریں و شب آرا
مرے پڑوس میں رہتی ہے اک مہ پارہ

اختر انصاری

کوشش

دریاز ابھی ہے زندگی کا !
پلکیں ہیں کہ نیند سے ہیں بوجھل   اعضاء ہیں تھکن کے بار سے شل
ہنگامے زمیں کے چاہتے ہیں
کمزور و نحیف و ناتواں کو
آغوش میں لے کے پیس ڈالیں
اک مشتِ غبارِ استخواں کو
گردش میں زمیں کی بلا دیں
اور اذنِ فغاں نہ ہو زباں کو
مہتاب کا نور چھوٹ جائے   سورج کا زجاج ٹوٹ جائے
بیمار و نزار و ناتوانو
یہ وسعتِ کوہ و دشت و دریا
اک جست میں اس کو پھاند جاؤ
دریاز ابھی ہے زندگی کا !
گو اشک ڈھلک رہے ہیں ڈھلکیں   پیمانے چھلک رہے ہیں چھلکیں

اختر الایمان

آزار

کیا خبر تھی یہ تری پھول سے بھی نازک ہونٹ — زہر میں ڈوبیں گے، کُملائیں گے، مُرجھائیں گے
کس کو معلوم تھا یہ جشن تری آنکھوں کا — نور کے سوتے بھی تاریکی میں کھو جائیں گے

تیری خاموش وفاؤں کا صلہ کیا ہوگا — میرے ناکردہ گناہوں کی سزا کیا ہوگی
قہقہے ہوں گے کہ اشکوں کی ترنّم ریزی — دلِ وحشی! ترے جینے کی ادا کیا ہوگی
کوئی اُلجھا ہوا نغمہ، کوئی سُلجھا ہوا گیت — کون جانے لبِ شاعر کی نوا کیا ہوگی
ہاں مگر دل ہے کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے — اِس سے بڑھ کر کوئی توہینِ وفا کیا ہوگی

اور یہ شور گرجتے ہوئے طوفانوں کا
ایک سیلاب سسکتے ہوئے انسانوں کا
ہر طرف سینکڑوں بل کھاتی دھوئیں کی لہریں
ہر طرف ڈھیر جُھلستے ہوئے ارمانوں کا
زندگی اور بھی کچھ خوار ہوئی جاتی ہے
اب تو جو سانس ہے آزار ہوئی جاتی ہے

معین احسن جذبی

قحطِ بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں

اِس خطۂ زرخیز میں یہ قحط یہ ادبار
غیروں کی سیاست کا اثر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں اُمنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بینائیٔ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں
ہونے کو ہے اِس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

اِک تیغ کی چشمک سی نظر آتی ہے مجھ کو
اِک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف اِن آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

جگر مرادآبادی

شش و پنج

اے عقل جنون زار میں جاؤں کہ نہ جاؤں — پھر دامنِ کہسار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
پھر دشتِ جنوں بار میں جاؤں کہ نہ جاؤں — منزل گہِ دشوار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
اب کوچۂ دلدار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

افکار کے اِس گنبدِ سیمیں سے گزر کر — اِس دائرۂ انجم و پرویں سے گزر کر
اِس تازہ رصدگاہِ جہاں بیں سے گزر کر — تمکین کے اِس گوشۂ تسکیں سے گزر کر
طوفان کے دربار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

بیٹھا ہوں سرِ جلوہ گہِ عامِ تفکر — رگ رگ میں لیے بادۂ گلفامِ تفکر
اِک عمر سے ہوں معتکفِ بامِ تفکر — مدت سے ہوں منجملۂ خدامِ تفکر
اب حُسن کی سرکار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

اِس کارگہِ جسرو درہ کل سے نکل کر — لمحاتِ تجسس کے تسلسل سے نکل کر
تحقیق کی اِس انجمنِ گل سے نکل کر — حکمت کدۂ فکر و تامل سے نکل کر
عشرت کدۂ یار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

اسرار کی ہلچل ہے سرِ کوئے خموشی — تقریر کی شمشیر ہے ابروئے خموشی
طغیانِ فصاحت ہے نمِ روئے خموشی — مدت سے ہوں وابستۂ گیسوئے خموشی
اب حلقۂ گفتار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

اِس بارگہِ علم و حقیقت سے گزر کر — اِس ہوش رُبا ذہن کی وسعت سے گزر کر

اِس ولولہ انگیز قناعت سے گزر کر — اِس دامنِ اندک کی بصیرت سے گزر کر
پھر محشرِ بسیار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

حکمت نے مجھے لُوٹ لیا وائے مقدّر — اِک عالمِ تُو ہے دلِ مرحوم کے اندر
سینے ہی میں دوزخ ہے نہ آنکھوں میں سمندر — داغوں ہی کے سکّے ہیں نہ اشکوں ہی کے گوہر
اب عشق کے بازار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

ہر سانس ہے یاں حکمت و دانش کا علمدار — ہر گام ہے یاں فکر کی پازیب کی جھنکار
ہر حرف سے اِک لشکرِ معنٰی ہے نمودار — رقصِ خوشِ کونین ہے اور صحبتِ افکار
کوئے دلِ بیمار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

دانش کی محک عقل کی مقیاس کو تج کر — تاجِ سرِ حکمت کے اس الماس کو تج کر
اس نکتہ رس و معتدل احساس کو تج کر — لحنِ قلم و کاکلِ قرطاس کو تج کر
صحنِ رسن و دار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

یاں شحنۂ سلطاں ہے نہ اندیشۂ شب خوں — ہر لفظ کے قطرے میں صحائف کا ہے جیحوں
رہ رہ کے برستا ہے یہاں بادۂ گلگوں — بحرِ نظر و فکر کی ہر موج ہے افسوں
شہرِ لب و رخسار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

مُنہ پھیر کے اے جوشؔ متاعِ سندی سے — بہتی ہوئی اس حرف و معانی کی ندی سے
اس حورِ قلم کی کششِ سرو قدی سے — اِس نظم کی فردوسِ بہارِ ابدی سے
پھر بزمِ گل و خار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

جوشؔ ملیح آبادی

ترکِ عمل

یہ میری پاشکستگی، یہ بے کسی، یہ بے بسی
عمل کی راہ کے مسافروں کی خستگی نہیں

یہ کارسازِ زیست کی صعوبتوں سے ہار کر
گھٹی ہوئی، تھکی ہوئی، شکست خوردگی نہیں

ستم کے طرز دیکھ کر، جفا کے طور دیکھ کر
جو رہ گئی ہو دب کے ہونٹ میں، یہ وہ ہنسی نہیں

ابھی ہے میرے خون میں نمو کی شوخ تازگی
فسردگی خیال پر یہ انحطاط کی نہیں

قدم جرا زمیں پر، نگاہ مہر و ماہ پر
مگر اب اس کو کیا کروں وہاں بھی روشنی نہیں

طرب فزا فضا بھی ہے، بہار کی ہوا بھی ہے
چلوں تو سیرِ باغ کو کلی مگر کھلی نہیں

وفورِ خوف پر نہیں بنائے اضطرابِ دل
خلش ہے اشتیاق کی، الم کی بے کلی نہیں

میں تپ چکا ہوں دھوپ میں، میں جل چکا ہوں آگ میں
شرارِ غم کی سرکشی قدیم ہے نئی نہیں

میں برگِ خشک ہوں مگر قسیمِ امید و بیم کی
کہ برقِ شاخ سوز سے خیالِ دوستی نہیں

صدائیں ہیں کہ "بڑھ چلو" مگر یہ کب؟ کدھر؟ کہاں؟
بظاہر اک بڑی سی بات، اور بات بھی نہیں

میں جنگ بہرِ جنگ کا حمایتی کبھی نہ تھا
عمل بذاتِ خود مرا فلسفہ کبھی نہیں

ہے ایک مقصدِ بلند میرا مطمحِ نظر
وہ مقصدِ بلند کوئی سحرِ سامری نہیں

یہی کہ زندگی کو زندگی کا مرتبہ ملے!
کہ کھل کے سانس لینے کی جگہ ابھی ملی نہیں

رگوں میں دوڑتا لہو بھی جیسے بند بند ہے
نفس نفس میں رابطہ بھی ہے مگر قوی نہیں

میں چاہتا ہوں کھل کے کوئی جا لگے آسماں پر
بھلائے دار و گیر کی بِنا شہنشہی نہیں

یہ سب نہیں تو ہیچ ہے "عملؔ عملؔ" کا تذکرہ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ یہ عمل بہ اصلِ حال نفی بے حسی نہیں
یہی تو ہے کہ رُک گیا ہوں چلتے چلتے راہ میں ‏ ‏ ‏ ‏ نہیں تو اب بھی جوش و عزم میں کوئی کمی نہیں
عزیزا! میری منزلیں بھی سخت و زشت و صعب ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ خموشیوں کی اُلجھنوں میں کرب ہے خوشی نہیں
جو استراحتوں کے جال میں کبھی پھنسی نہ ہو ‏ ‏ ‏ ‏ بھلی نہیں نہ ہو، مگر وہ زندگی بُری نہیں
خرید کر سکے جسے نہ سکّہ ہائے سیم و زر ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ اور ہو تو ہو مگر وہ "میر جعفری" نہیں
جو آج شل ہیں دست و پا تو اور کچھ ہے ماجرا ‏ ‏ ‏ ‏ کہ اب عمل میں بھی پیامِ امن و راستی نہیں
جبینِ حریت پہ کر رہے ہیں وار تیشہ زن ‏ ‏ ‏ ‏ فریبِ پیرزن بھی کیا کمالِ خسروی نہیں
یہ حال جانتا ہوں میں، یہ رنگ دیکھتا ہوں میں ‏ ‏ ‏ ‏ مگر خموش ہوں کہ چارہ عجزِ خامشی نہیں
جلا رہا ہوں کل کے راستوں پہ شمعِ زندگی ‏ ‏ ‏ ‏ مگر یہ دھندلی روشنی علاجِ تیرگی نہیں

کچھ اور وقت چاہیے کچھ اور فکر چاہیے
عملؔ ہے میری جاں عمل، یہ کوئی دل لگی نہیں

جواد زیدی

پیدا کر

جنتِ دید بہ اندازِ دگر پیدا کر
حسن آباد ہو جس میں وہ نظر پیدا کر

کب سے پامال ہیں یہ ترکِ طلب کی راہیں
عشق کی ایک نئی راہ گذر پیدا کر

کیا ہوا اگر تیری راتیں رہیں بیگانۂ خواب
حسن بیدار ہو جس سے وہ سحر پیدا کر

فلکِ عشق کے ٹوٹے ہوئے تاروں کی قسم
اک نئی انجمنِ شمس و قمر پیدا کر

درِ جاناں پہ اگر حسرتِ سجدہ ہے تجھے
عرش جس کے لئے جھک جائے وہ سر پیدا کر

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
ہاں فضا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

جاوداں جن سے بنے انجمنِ نیم شبی
وہ ستارے کبھی اے دیدۂ تر پیدا کر

کوئی منزل جسے پایانِ سفر کہہ نہ سکے
وہ تمنا وہ تقاضائے سفر پیدا کر

عشرتِ وعدۂ فردا جو یہی ہے تو روشؔ
اک نیا سلسلۂ شام و سحر پیدا کر

روشؔ صدیقی

نفرت

یہاں زبان ہے خاموش، ذہن پرادبار　　چھپے ہوئے ہیں جہالت میں عقل کے انوار
یہاں تو سانس بھی لینا ہے ہم نشینِ شعار　　کہ زندگی نہیں بخشا ہے مستقل آزار

چلو یہاں سے کہیں دُور اور دُور چلیں

یہاں کسی کو ابھی قیمتِ حیات نہیں　　جوانیاں ہیں مگر روحِ کائنات نہیں
یہ جانتا ہوں کہ اس دَور کو ثبات نہیں　　مگر کشاکشِ احساس سے نجات نہیں

چلو یہاں سے کہیں دُور اور دُور چلیں

یہ ظلم گاہ یہ سرمایہ دار کی دُنیا　　جہاں پہ بندہ نہیں کوئی بس ہیں خدا
جہاں غریب کی آہوں سے عطر بیز ہوا　　سِسک رہی ہے جہاں زندگی کی نشوونما

چلو یہاں سے کہیں دُور اور دُور چلیں

وہ ہے کرامت و بخشش فسوں طرازِ فرنگ　　چڑھا رہا ہے نمائش پرستیوں کا رنگ
جبھی ہیں جذبے سے خالی جوانیاں بے رنگ　　نہ حوصلے نہ تڑپ اور نہ ولولے نہ اُمنگ

چلو یہاں سے کہیں دُور اور دُور چلیں

سمجھ سے دُور ہے اس رازگاہ کا عالم　　کہ ایک سانس کی خاطر ہزار طرح کے غم
یہ اُلجھنیں، یہ حوادث، یہ آفتِ پیہم　　ٹھہرا ہے شدتِ احساس گھٹ چلا ہے دم

چلو یہاں سے کہیں دُور اور دُور چلیں

آغا سرخوش قزلباش

جبر وقدر

گھیر لی تھی ہم نے کتنوں سی جہاں ہرنوں کی ڈار تھے اُسی اوجھل میں تیتر محوِ حمدِ کردگار
شام کو گھر کی طرف پلٹے یہ اپنی قول و قرار کل سحر کے وقت کھیلا جائیگا انکا شکار
سب کو چُن چُن کر فنا کے گھاٹ اُتارا جائے گا
سر نکالا نیستاں سے جس نے، مارا جائے گا

ایک ساعت بھی نہ گزری تھی ابھی بارشیں رُکے ہو کے ٹھنڈے ابر کے ٹکڑے زمیں پر جھک پڑے
رات میں بلی کی آنکھیں تھیں کہ برقی قمقمے بھاپ دیتی تھی نفس کی "آمد و شد" کہرے سے
یوں جلن محسوس ہوتی تھی ٹپک ملنے کے ساتھ
جیسے چھو جاتے ہیں آنکھوں سے کبھی مرچوں کے ہاتھ

کھا کے سردی منہ سے ہر بندوق دیتی تھی دھواں اوس میں رکھے ہوئے گنوں کا تاروں پر گماں
ہونٹ اور جبڑوں میں ٹھٹھری جا رہی تھیں انگلیاں پھر بھی اِس شیخی میں تھی مصروف ہر اکڑی زباں
ہم شکاری ہیں شکاری اور سردی کا سوال
"ایک اوچھا سا تصور ایک اونے سا خیال"

جا رہے تھے کیفِ خود بینی میں ہم مخمور سے شہر سے باہر ہوئے دو چار آس مغرور سے
جسکی خود مختاریاں بیزار ہیں مجبور سے آدمی اندھا نظر آتا ہے جس کو دور سے
جس کو رہتی ہے غریبوں سے "تمنائے ادب"
دشمنی آسودگی ہے جس کا ظلم بے سبب

پھر نظر آئی وہ "موٹر" "کبکِ سیر" و "موجِ رنگ"　　جس کا پردہ دستِ کافوری میں اک گوشہ بہ تنگ
تھا کبھی حاضر کبھی غائب شبابِ شوخ و شنگ　　مسکراتی تھی حیا پر بے حجابی کی اُمنگ

تہ بہ تہ غازہ نگاہِ جلوہ بیں پر بار تھا
حُسن سے زائد فریبِ حُسن کا "پرچار" تھا

"پا پیادہ" پھر کئی جوڑے ملے آتے ہوئے　　مشرقی رسمِ چہل قدمی سے کتراتے ہوئے
گھر میں بائیں باغ جنگل کی ہوا کھاتے ہوئے　　سر بہ سر مغرب کی نقالی پہ اِٹھلاتے ہوئے

"کثرتِ بادہ" سے ہر شب خوابِ نوشیں میں خلل
یہ ہوا کھانا مگر اُس نقصِ صحت کا بدل

ہم سے آگے جا رہا تھا گاؤں کا وہ نوجواں　　جس کی سرگرمی پہ برساتا ہے اولے آسماں
جس کا خرمن پھونکتی ہے فطرتِ نامہرباں　　دودھ جس کی گائے کا جاتا ہے شاہو کے ہاں

جس کے بیلوں کو کبھی مہلت نہیں بیگار سے
جس کو چھٹکارا نہیں شیطان کی پھنکار سے

"عاملِ دیہات" دورے پر اسی کا میہماں　　مرغ و مسکہ نوش گرداور اسی کا میہماں
شحنۂ بے رزق و بے بستر اسی کا میہماں　　شہر کا ہر "سیٹھ" ہر "موٹر" اسی کا میہماں

ہر وبالِ ضلع اس کے مال اس کی جان پر
"صادق و الحق" ہے طویلہ کی بلا بندر کے سر

دھوپ چمکی تھی کہ ہم نے تیتروں کو جا لیا　　پے بہ پے اتنے ہوئے "فائر" کہ جنگل گونج اٹھا

ایک بیچارے کے بازو یہ گرے دھڑ وہ گرا   جان دی اُس نے زمیں پر وہ ہوا میں چل بسا

ظالموں کی دل لگی تکمیل پاتی ہے یونہی

بے ضرر مخلوق کو دُنیا ستاتی ہے یونہی

شاد عارفی

نغمۂ کہسار

مری حیات کو اک سوزِ مستقل کر کے
دیارِ شوق میں اک شمع مشتعل کر کے
خدا ہی جانے کہاں وہ چلی گئی ہے ندیم

شبِ بہار کا دھندلا سا خواب باقی ہے
مرے پیالہ میں اب تک شراب باقی ہے
شراب جس کو وہ چھلکا گئی تھی مرے ندیم

یہ کہہ رہی تھی وہ ہے مرغزار کی دنیا
مرے وطن میں ہے اک آبشار کی دنیا
وہ آبشار یہاں بھی رواں ہوتے ہیں ندیم

نہیں رباب میں گر ایک تار بھی نہ سہی
طویل شام کا رنگیں خمار بھی نہ سہی
وہ میری رُوح کو نغمہ سُنا رہی ہے ندیم

وہ دلنواز نگاہیں، وہ مخملی باہیں
وہ حُسن و شوق کی رنگین و مُختلط راہیں
وہ میری رُوح میں، دل میں سما رہی ہے ندیم

یہ آرزو ہے کہ کب غم حرام ہو جائے
کبھی قبول ہمارا سلام ہو جائے

خدا ہی جانے کہاں وہ چلی گئی ہے ندیم

خدا ہی جانے وہ کب مڑ کے آئیگی اے دوست
وہ کب حیات کو جنّت بنائیگی اے دوست

دہکتے ہونٹوں سے وعدہ تو کر گئی ہے ندیم

ضیاء الاسلام

جنّت نظّارہ

اِس سمت بھی اک برقِ نظر ای گُلِ خنداں
اِک موجۂ نکہت اِدھر ای جانِ گلستاں

بس ایک کرن ڈال سرِ دامنِ ہستی
اِک چھوٹ سی پڑ جائے اِدھر اے مہِ تاباں

لہراتی ہوئی قوسِ قُزح ہے کہ ترا جسم
اُٹھتے ہیں قدم یا لہک اُٹھتا ہے گلستاں

اِک لوچ بھری لے ہے کہ ہے نرمیٔ رفتار
سینے میں جوانی کے چھینٹے پڑتے ہیں طوفاں

سیّال شفق مارتی ہے موجوں پہ موجیں
اِک رنگ کا طوفاں ہے کہ ہے جوشِ بہاراں

لو پھوٹ رہی ہے زِ جبیں تا بہ کفِ پا
یا چادرِ شبنم میں جھلکتا ہے گلستاں

آنکھوں میں محبّت کی جھجکتی ہوئی بجلی
سینے محبّت کے مچلتے ہوئے ارماں

شوخی رِ حیا کے بھی دبائے نہیں دبتی
لو دیتا ہے کیا کیا یہ چراغِ تہِ داماں

آ گئے ترے اے شوخ یہ عالم ہے کہ گلزار
اِک رنگِ پریدہ ہے کہ اک بوئے پریشاں

یہ حُسن کی مستی ہے کہ جیسے یہ گھٹا چھائی
یہ موجِ تبسّم ہے کہ مست رہیں چراغاں

تو رات کا ہے رات سحر کا تو سحر ہے
تو شمع کا ہے شمعِ شبستاں کا شبستاں

ہر جُنبشِ دامن سے سسکتی ہیں ہوائیں
کیا لغزشِ مستانہ ہے اے سروِ خراماں

ہر سانس کوئی جھکی ہوئی نرم سی لَے ہے
لہراتا ہوا جسم ہے یا ساز ہے لرزاں

یا مدھ بھری پُروائی میں رس ڈول رہا ہے
مستانہ اداؤں میں ہے یا موج سی رقصاں

چہرے سے عیاں صبحِ درخشاں کی بہاریں
گیسو میں نہاں تیرگیٔ شامِ غریباں

لرزش سی ہے راہوں میں ہے شوخیٔ رفتار | جنبش سی ہے نظروں میں کہ ہے گردشِ دوراں
تو پاس سے گزرا کہ لپٹ مشک کی آئی | بجتی ہوئی نظریں تھیں کہ آہوئے گریزاں
اے دوست چہکتی ہیں ابھی تک وہ فضائیں | جن میں تھا کھلا تیرے تبسّم کا گلستاں
ہونٹوں میں دبے خندۂ پنہاں کے شرارے | آنکھوں میں ہے دنیا کے بدل دینے کا ساماں
باتوں میں ہیں جی اُٹھنے کے مُردوں کو اشارے | گھاتوں میں ہیں دنیا کے مٹا دینے کے امکاں
عارض کی جھلک ہے کہ چھلک جاتی ہیں ساغر | ماتھے کی دمک ہے کہ طلوعِ مہِ تاباں
ابرو کی لچک ہے کہ لپک جاتی ہے شمشیر | گیسو کی لٹک ہے کہ گھٹائیں ہیں خراماں
رگ رگ میں کسک ہے کہ اک آتی ہوئی انگڑائی | سینے کی لہک ہے کہ چھلکتا ہے گلستاں
چہرے کی چہک روکشِ خوشبوئے گلِ خلد | باتوں کی چہک جلوہ دہِ لعلِ بدخشاں
اے دوست یہ تو ہی ہے جسے دیکھ رہا ہوں | یا خواب ہے شاعر کا کوئی شعلہ بداماں

پڑتے ہی نظر تجھ پہ محبت نے پکارا
نکلا وہ نصیبوں کو جگاتا مہِ تاباں

فراق گورکھپوری

تغیّر

تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے   شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی   دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر   صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز   مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں   لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی
اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی   یہ گرانباریٔ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

فیض احمد فیض

کوکب

گر پڑی برقِ ستم چرخِ ستم ایجاد پر
کوکب اک تبخالۂ غم ہے لبِ فریاد پر

لیلیٔ شب غرق ہے اک فکرِ نامعلوم میں
ڈبڈبا آیا ہے آنسو دیدۂ مغموم میں

کشتیِ دل قلزمِ بیم و رجا میں پھینک دی
توڑ کر کس نے کلی ہائے فضا میں پھینک دی

پھرتے پھرتے جستجوئے جلوۂ مستور میں
پڑ گیا ہے آبلہ پائے شبِ دیجور میں

مضطرب ہے مرتعش ہے لرزہ براندام ہے
پارۂ سیماب ہیں کس کا دلِ ناکام ہے

تابشِ غم سے اڑا اڑ کر شرارا ہو گیا
دل فضا میں اس قدر ڈوبا کہ تارا ہو گیا

پھٹ پڑا اے لیلیٔ شب تجھ پہ طوفانی شباب
دیکھ آوارہ نہ ہو جائے یہ ننھا سا حباب

نقشۂ آدم جبینِ چرخ پر مرقوم ہے
مٹ نہ جائے یہ نشانِ سجدۂ معصوم ہے

مسکرا کر سایۂ دامن میں اپنے لے اسے
مشعلِ راہِ ہدایت ہے نہ بجھنے دے اسے

جلوۂ فردوسِ خلدِ حسن ملنے دے ابھی
ناشگفتہ غنچۂ نرگس ہے کھلنے دے ابھی

مزرعِ ہستی کا یہ دانہ ہے محتاجِ نمو
آبِ گوہر جلوۂ شبنم سے اس کو سینچ تو

حسنِ کفر انگیز کی نیرنگیاں ملحوظ رکھ
قشقۂ سیمائے فطرت ہے اسے محفوظ رکھ

دیکھ فردوسِ نظر کا پیکرِ نوری ہے یہ
عارضِ نیلم پری پر خالِ کافوری ہے یہ

اِک چراغِ نور روشن ہے فرازِ طور پر
یا سرِ منصور ہے دارِ شعاعِ نور پر

مرکزِ قلب و نظر، جلوہ گہِ عالم ہے یہ
بے خبر! آئینہ دارِ قسمتِ آدم ہے یہ

قسمتِ آدم! حنا بندِ عروسِ زندگی
جس کے جلووں سے شبستاں تا بیاباں تابندگی

جس کا ہر تارِ نظر، تارِ گریبانِ حیات
جس کا ہر نقشِ قدم نقشِ جبینِ کائنات

جس کی حیرت جوہرِ آئینۂ ناسوت ہے
جس کی خاموشی سرودِ بربطِ لاہوت ہے

فیض جھنجھانوی

جھٹ پٹے میں ایک سبق

ابھی سورج نہیں رخصت ہوا تھا — ابھی چاند اس کو تکتا ہی تھا چھپ کے
ابھی رنواس میں تھی رات رانی — ہوا کچھ گا رہی تھی چپکے چپکے
پرندے پوٹے بھر کر آ رہے تھے — کہ جا کر اپنے پیاروں کو بھرائیں
ادھر وہ ننھے منھے چوزے بچے — کئے جاتے تھے چوں چوں چائیں چائیں
نکالے گھونسلوں سے سر تھے بچے — کہ لاتی ہوں گی مائیں ان کا چوگا
وہ پھڑکاتے تھے اپنے ننگے بازو — اور اس کے ساتھ چیں چیں کا بھی غل تھا
چلا آتا تھا خود بو قدمہ ریوڑ — نہ تھی لاٹھی کی ان پر دھائیں دھائیں
گوالا گنگناتا ڈھیلے ہاتھوں — لئے آتا تھا بھینسیں اور گائیں
فجر سے کھیت کا سب کر کے دھندا — لئے بیل اور ہل آتا تھا ہالی
پسینا، گرد، مٹی کل بدن پر — دمکتی تھی مگر چہرے پہ لالی
نکلتے تھے کچھ انساں تیلی گھر سے — ہزاروں کی رقم کی کر کے محنت
مگر تھے جیب میں تو چند آنے — انھیں سے ہوتی تھی کنبے کی خدمت
لپیٹے چیتھڑے اور بال بکھرے — فلاکت زادے بغلوں میں دبا کر
پھٹی تھیلی لئے اور ٹوٹی کلھیا — کھڑی تھیں عورتیں چند اک دوکاں پر
کہ لیں تیل اور نون اور جو چبینا — سبینا جا کے روٹی کا کریں گھر
ادھر ملیبہ نہ تھا آٹے میں ان کی — ادھر بنئے کی ضد تھی نقد ہی پر

کسی دفتر سے چند آتے تھے بابو
شبابیت ذرا اُن میں نہیں تھی

بہارِ عمر کا وہ مضحکہ تھے
خزائیں تیس سے کم دیکھی ہونگی

تھے آنکھوں پر لگے شیشے کے ٹکڑے
جُھکی کمریں تھیں چہرے زعفرانی

تھے کملائے سے مُرجھائے ہوئے سے
گئی تھی بیٹھ اُٹھتے ہی جوانی

جوانی سے تھی اُن کی مات پیری
اُنھیں بوڑھا جواں کہنا بجا تھا

تھے دل مُردہ تو پژمُردہ تھے چہرے
تبسّم تھا تو وہ شیون نما تھا

قریب اِک گھر بھی تھا باغیچہ والا
جہاں تھیں کرسیاں کوچ اور میزیں

لدی میزیں مٹھائی اور پھلوں سے
تکلّف سے سجی تھیں ساری چیزیں

لباسِ فاخرہ پہنے تھے مہماں
تبسّم تھا ہنسی تھی قہقہے تھے

وہ انساں تھے کہ تھے سونے کی چڑیاں
وہ باتیں پیار بھری چہچہے تھے

تھے کیک اور پیسٹری کلّوں کے اندر
تو تھے ہاتھوں میں ساغر جگمگاتے

خور و نوش اور جوئے کا بھی تھا سنگم
تھے پتّے تاش کے بھی پھڑپھڑاتے

غرض دعوت میں تھے مصروف سارے
اُن سب کا تماشا دیدنا تھا

کہ اُس دولت بشاشت سے مکاں پر
ہوا اِک بوڑھے فاقہ زدہ کا آنا

ضعیف اتنا کہ پنجر رہ گیا تھا
نہیں تھا کوئی مُنھ میں دانت باقی

بھڑکتی فاقہ کی وہ آگ اندر
نہ ہوگی پیٹ میں اک آفت باقی

وہ دروازے پہ جا پہنچا کسی طور
بچی طاقت کو ہونٹوں سے سمیٹا

کھنکارا، کانپا، لاٹھی کو پکڑ کر
پُکارا بابا دو دن کا ہوں بُھوکا

صدا اندر جو پہنچی میزباں تک — بہت طیش آیا اُس مردِ خدا کو
پکارا نوکروں کو اندھے ہو تم — گھُسا آتا ہے کون؟ اس کو نکالو
غلاموں کا غلام اک لپکا آیا — اور آتے ہی نہ کچھ دیکھا نہ بھالا
لپوٹا اک دیا کچھ ایسا کس کر — کہ بُوڑھا ہو گیا بس مرنے والا
وہاں اِک نیک مرد آنکلا اس وقت — تڑپتے بُوڑھے کو اُس نے اُٹھایا
بدن سہلایا اُس کا دی تسلّی — کٹورا دُودھ کا لاکر پلایا
کھُلیں آنکھیں ذرا دم اُس کا ٹھہرا — بہت چوٹوں کے دُکھ سے کسمسایا

یہی کہتا تھا وہ دودھ! آہ یہ دودھ!!
پلایا ماں نے یا تو نے پلایا

کیفی دہلوی

ساقی نامہ

زمانہ کی رسالت پر تری ایمان ہے ساقی
مگر الفت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقی

ترے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا
ترا اخلاق تو قرآن ہی قرآن ہے ساقی

مشیت بھی تری مرضی کے تیور دیکھ لیتی ہے
بایں اقرار عبدیت یہ تیری شان ہے ساقی

تجھے جس نے نہ پایا وہ خدا کو پا نہیں سکتا
کہ تیری معرفت اللہ کی پہچان ہے ساقی

کسی صورت ترے دربار اقدس تک پہنچ جاؤں
مجھے دشوار ہے تیرے لیے آسان ہے ساقی

ترے آنے ہی انسانیت کبریٰ ابھر آئی
زمانہ پر ترا احسان ہی احسان ہے ساقی

گنہگاروں کی نظریں تیری جانب اٹھ رہی ہونگی
ہجوم حشر میں تیری ہی پہچان ہے ساقی

نہ وہ ایمان کی گرمی نہ وہ تنظیم امت کی
نہ مصر و شام پہلے سے نہ وہ ایران ہے ساقی

خلافت دے کے بھیجا تھا جسے حق نے زمانہ میں
وہی انسان اب مغرب زدہ انسان ہے ساقی

مری آنکھوں نے دیکھی ہے عجم کی بزم آرائی
غضب ہے محفل بغداد بھی ویران ہے ساقی

نگاہ و دل پہ قبضہ کر لیا ہے علم حاضر نے
کوئی منکر کوئی باغی کوئی حیران ہے ساقی

جہاں میں انتشار و برہمی کا دور دورہ ہے
ادھر طغیان ہے ساقی، ادھر طوفان ہے ساقی

بتوں کی طرح قبروں کی طرف پیشانیاں خم ہیں
خدا کے ماننے والوں کا یہ ایمان ہے ساقی

خداوندان دولت کی خدائی آہ کیا کہیے !
کوئی فرعون ہے ساقی کوئی ہامان ہے ساقی

مسلماں نامسلمانوں کی صف میں آئے جاتے ہیں
کہ اب ایمان اک ٹوٹا ہوا پیمان ہے ساقی

جو ڈوبے ہیں نکل آئیں، جو گرتے ہیں سنبھل جائیں — توجہ سے تری اس کا ابھی امکان ہے ساقی
تری رحمت بالآخر رحم فرمائے گی امت پر
یہی اک چیز ہے جس سے کہ اطمینان ہے ساقی

ماہر القادری

عیادت

یہ کون آگیا رخِ خنداں لئے ہوئے
اور اس پہ رنگ و نور کا طوفاں لئے ہوئے

بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط
دل داریٔ نسیمِ بہاراں لئے ہوئے

رخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی
لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے

پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگیٔ صبحِ درخشاں لئے ہوئے

زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی
اک کاروانِ نکہتِ بستاں لئے ہوئے

اک اک ادا میں سینکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لئے ہوئے

آہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز
ظلمت کدے میں شمعِ فروزاں لئے ہوئے

پھر سے سوادِ شوق کا خورشیدِ نیم شب
عزمِ شکستِ ماہ جبیناں لئے ہوئے

دریں سکون و صبر بہ ایں اہتمامِ ناز
نشتر زنیٔ جنبشِ مژگاں لئے ہوئے

آنکھوں سے ایک روشنی کھلتی ہوئی ہر آن
غرقابیٔ حیات کا ساماں لئے ہوئے

ہنستی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے

یہ کون ہے مجاز سے سرگرمِ گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لئے ہوئے

مجاز

جنگِ آزادی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
سارا یہ سنسار ہمارا پورب پچھم اتر دکھن
ہم افرنگی ہم امریکی ہم چینی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن آہن پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی جس دنیا میں سوراج نہ ہو

وہ آزادی آزادی کیا مزدور کا جس میں راج نہ ہو

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

آزادی کے پرچم کے تلے

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا

گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی

محکوموں کی مجبوروں کی

آزادی کے متوالوں کی

دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

مخدوم محی الدین

جلوۂ معکوس

پنھر کتے گیتوں کے سایوں سے رات ہے بھرپور
یہ تیرگی — کہ ہو جیسے کوئی سیہ انگور

تصوّراتِ درخشاں پہ چھائی جاتی ہے
تصورات کہ جن سے صبا لجاتی ہے

جو چھپ کے آتے ہیں، رکھتے ہیں نرم نرم قدم
رمیدہ بُو کوئی آہو ہو جیسے گرم قدم

تصوّرات کی آمد محل ہیں خوابوں کے
کشاں کشاں لئے آتی ہے رنگ گیتوں کے

یہ گیت سائے ہیں اور دل پہ رات چھائی ہے
شبِ فراق سے کیوں مجھکو ہمنوائی ہے؟

درونِ خانہ کا منظر برونِ خانہ ہے
ہر ایک لب پہ غمِ ہجر کا فسانہ ہے

فسانہ خواں تو مگر ہوگا اُس کی محفل ہیں
خیال جس کا ہے بیدار اب مرے دل ہیں

یہ میرا دل ہے کہ جنگل ہے اِک خیالوں کا

بچھا ہے دامِ فسوں گر سیاہ بالوں کا
اور آرزوؤں کے طائر مچلتے آتے ہیں
اور اُس کے گیسوئے مشکیں میں جھلملاتے ہیں
رہائی چاہتے ہیں قید ہوتے جاتے ہیں
قفس کے نغمہ کی مستی میں کھوئے جاتے ہیں!
یہ نغمہ اُن کو بہت مضطرب بناتا ہے
اور اُن کے ساتھ خود بھی تھرکتا جاتا ہے
یہاں تک آہ کہ تھک جاتے ہیں وہ کاوش سے
تو نغمہ پہلو بدلتا ہے اپنی لرزش سے
اور اُس کی کروٹیں ماحول کو لبھاتی ہیں
تھرکتے گیتوں میں سایوں کے گھُلتی جاتی ہیں
اور اِس پہ جاگتی ہے دل میں داستانِ خموش
پکار اُٹھتی ہے فرقت میں یوں زبانِ خموش

درونِ خانہ کا منظر برونِ خانہ ہے
ہر ایک لب پہ غمِ ہجر کا فسانہ ہے

میراجی

ترکِ رسم و راہ

دوستی بھی موجبِ بیگانگی پائی گئی — دل میں بے مہری نظر میں برہمی پائی گئی
اس میں کیا میرے غرورِ عشق پر الزام ہے — تیری جانب سے محبت میں کمی پائی گئی
ظاہراً چشمک تو ہوتی ہے محبت کی دلیل — روح کی گہرائی میں برگشتگی پائی گئی
تیرے جلووں سے مرا ذوقِ نظر تھا فیضیاب — تو نظر آیا جہاں تک روشنی پائی گئی
رفتہ رفتہ تو مری نظروں سے اوجھل ہو گیا — خود ہی پردے پڑ گئے جب تیرگی پائی گئی
وہ تکلف بارِ رسم و راہ تھا جس کے سبب — انتہا یہ ربط میں بیگانگی سی پائی گئی
جب کبھی میں پا رہا تھا الفت میں فقط ہمی خلوص — اس گماں میں اب یقیں کی پختگی پائی گئی
ہوش والوں سے یہ راہ و رسم نبھ سکتی نہیں — تیرے ہر انداز میں دیوانگی پائی گئی
یوں کمی دنیا کے ہر انساں میں ہوتی ہے مگر — تجھ میں تو انسانیت کی بھی کمی پائی گئی

ایسے ربط و ضبط سے اے دوست کچھ حاصل نہیں
جس میں قلب و روح کی گہرائیاں شامل نہیں

دوستی عریاں حقیقت دوستی اسرار بھی — دوستی تشنہ لبی بھی دوستی سرشار بھی
دوستی گل کا تبسم دوستی بستہ کلی — دوستی خوابیدہ بھی ہے دوستی بیدار بھی
دوستی دراصل ہے یکجائیِ مرگ و حیات — دوستی آسان بھی ہے دوستی دشوار بھی

اس میں اپنے سے سوا رہتا ہے ہمدم کا خیال
دوستی اک کیف بھی ہے دوستی آزار بھی

دوستی نفیِ دل و جاں دوستی اثباتِ زیست
دوستی انکار بھی ہے دوستی اقرار بھی

دوستی رنگِ خزاں ہے دوستی حسنِ بہار
دوستی مجبور بھی ہے دوستی مختار بھی

سعیِ لاحاصل ہے گاہے حاصلِ کون و مکاں
دوستی بیکار بھی ہے دوستی باکار بھی

خود فراموشی یہاں دراصل عینِ ہوش ہے
دوستی مدہوش بھی ہے دوستی ہشیار بھی

دوست کی مرضی پہ ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے دوست
دوستی دیندار بھی ہے دوستی میخوار بھی

زندگی میں اپنے قول و فعل کو یکجا بنا
دوستی کو ظاہر و باطن کا آئینہ بنا

نخشب جارچوی

چورنگی

پہلا رنگ

جس نے بھی دیکھا ہے، ناچار پکار اٹھا ہے
کاش۔ اِک بار۔ پھر اِک بار اِدھر سے آتے

ہو گئے چار طرف شوخ نگاہوں کے ہجوم
ہیں تو حیراں ہوں وہ آئے تو کدھر سے آئے

لاج کی ماری لگی جاتی ہے دیوار کے ساتھ
کیا کرے سن کا تقاضا ہے کہ شرما کے چلو

انگلیاں تک نظر آئیں نہ کسی راہی کو
کالے کھدر کے دوپٹے کو نہ لہرا کے چلو

دوسرا رنگ

جس نے بھی دیکھا ہے ناچار پکار اٹھا ہے
اُف یہ بیباک نگاہی یہ بھبھوکا چہرہ

کس کی آنکھوں پہ یہ زلفوں کی گھٹا چھائیگی
کس کی قسمت میں ہے یہ لا متناہی سہرہ

یوں چلی جاتی ہے جیسے کوئی آوارہ غزال
جس کو صحراؤں کی پہنائیاں دہلا نہ سکیں

یوں قدم اٹھاتی ہے جیسے کوئی شہزادی
جس کو ایوانوں کی رعنائیاں بہلا نہ سکیں

تیسرا رنگ

جس نے بھی دیکھا ہے، ناچار پکار اٹھا ہے
مضمحل کیوں نظر آتی ہے یہ سیماب سرشت

پاؤں اُٹھتے ہیں کہ چکراتی ہے دنیائے جمال
بال اڑتے ہیں کہ جلتا ہے جوانی کا بہشت

آج ان آنکھوں میں وہ مشعلۂ جوالہ نہیں
جس نے بے مایہ چراغوں کو اُبھرنے نہ دیا

ناخدائی کا وہ انداز نہیں جس نے ہمیں
عین طوفاں میں بھی ساحل پہ اُترنے نہ دیا

چوتھا رنگ

اب کے جو دیکھیے وہ انگشت بدنداں ہے یہاں
میں مگر کب سے سمجھتا ہوں معمائے حیات

حسن اگر رنگ نہ بدلے تو جوانی مٹ جائے
دِن کو دِن کون کہے، دِن کو جو حاصل ہو ثبات

بھوسلے بالوں کو چادر میں چھپاتی خاتون!
کاش تجکو بھی اِن اسرار کا عرفاں ہوتا

تو اگر جانتی، فطرت کے کھلونے ہیں ہم
اپنے ماضی پہ ترا قلب نہ گریاں ہوتا

نوعِ انساں کو تشبیہوں سے اُبھارا نہ گیا
بس یہی نقشِ مشیت سے سنوارا نہ گیا

احمد ندیم قاسمی

رزمِ زندگی

دہر ہے عرصۂ ستم اہلِ ستم سے جنگ کر
لشکرِ غم ہے منہ نہ موڑ لشکرِ غم سے جنگ کر

نصرتِ دیر یاب ہے صبحِ سعادت نشاط
یعنی ابھی نحوستِ شامِ الم سے جنگ کر

دیر و حرم سے بے جہت نوعِ بشر اگر نہ ہو
دیر و حرم سے ہو خلاف دیر و حرم سے جنگ کر

تیرے نصیب میں ہو کیوں چارۂ سوزِ مستقل
اے گروہِ سپردِ نار! اہلِ ارم سے جنگ کر

لازمۂ حیات ہے، رزم حیات کا ثبوت
جرأتِ فقر سے بہ کُنہِ سطوتِ جم سے جنگ کر

گریۂ غم پہ خاک ڈال رخ سے عیاں نہ ہو ملال
دامنِ ضبط کو سنبھال دیدۂ نم سے جنگ کر

آج کہ ہر وہ غرّۂ مہرِ جہاں غرور ہے
شوخیٔ ذرّہ ہائے خاکِ گیتی بہم سے جنگ کر

ہاں یونہی جہدِ انقلاب ارضِ غلام کے لئے
ہاں یونہی خوابِ غفلتِ اہلِ عدم سے جنگ کر

پست و بلند کا خیال محفلِ دہر سے نکال
ذہنِ عرب سے کر نبرد فکرِ عجم سے جنگ کر

تو ہے جوان تیرے لئے ننگ ہے اتباعِ پیر
تیز خرام! رہبرِ سست قدم سے جنگ کر

غلغلہ ہائے حشر ڈال عرصۂ کائنات میں
یعنی ستیزہ کار ہو رہ گذرِ حیات میں

نہالؔ سیوہاروی

سخنہائے گفتنی

مانا کہ حسنِ یار میں اب بھی وہی ہیں شوخیاں
مانا کہ نبضِ عشق میں دوڑ رہی ہیں بجلیاں
اب بھی پپیہے کی صدا دشت میں تھرتھراتی ہے
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
لوحِ جبینِ رقت پر کتنی بڑی خراش ہے

مانا رُخِ گلاب میں اب بھی وہی ہیں نرمیاں
مانا شرارِ سنگ میں اب بھی وہی ہیں گرمیاں
مانا کہ آسمان پر تاروں کی انجمن وہی ہے
مست گھٹا کی زلف سے کوندے کا بانکپن وہی
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
شاعرِ عصر کا جگر چوٹوں سے پاش پاش ہے

مانا رباب و چنگ کے نغموں میں زیر و بم وہی
مانا کہ فیلسوف کے ہاتھ میں بھی قلم وہی
مانا کہ جبر و قدر کا ٹوٹا نہیں طلسمِ راز
ذکرِ بہشت و فکرِ حور اب بھی بہت ہے دلنواز

لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
زخمی دل و دماغ کو مرہموں کی تلاش ہے
مانا کہ خاک و خون کے تذکرے ہیں گھناؤنے
مانا کہ انقلاب کے معرکے ہیں ڈراؤنے
آج بھی رنگ و بو کی وہ بھولی ہوئی کہانیاں
موقع ملے تو چھیڑ دیں ترسی ہوئی جوانیاں
لیکن ابھی تو سامنے زندگیوں کی لاش ہے
جذبۂ انتقام کی تیغ میں ارتعاش ہے

وامق بی۔اے